اکبر الہ آبادی

کے لطیفے

مرتبہ

نادم سیتاپوری

"قیمت"

ڈیڑھ روپیہ

ٹیلیفون نمبر
۷
۴۵۵۹

ناشر
نسیم بکڈپو لکھنؤ

ناشر: عزیز الرحمٰن
پرنٹر: سرفراز پریس لکھنؤ

"دو لفظ"

مولانا عبدالماجد صاحب دریابادی

حضرت اکبر مرحوم کی جو بھی خدمت کی جائے بہر حال
قابلِ قدر و تحسین ہے۔ ناظم سیتاپوری صاحب کی کتاب
کا مسودہ میں نے جا بجا الٹ پلٹ کر دیکھا اور جو باتیں
قابلِ اصلاح نظر پڑیں وہ انھیں لکھ کر دیں۔ ان شاء اللہ
اس کے بعد یہ کتاب حلقۂ اکبر شناس، اکبر پسند، اکبر دوست
کے اندر بھی ہاتھوں ہاتھ لی جائے گی۔

عبدالماجد

دریاباد ——— بارہ بنکی

۱۴ر نومبر ۵۴ء

رشیدہ کے نام

ناوک

مقدمہ

(غلام احمد فرقتؔ کاکوروی)

یقین مانئیے میں اب تک نادم سیتاپوری صاحب کو ہمیشہ سے اپنا بہی خواہ اپنا دوست، اپنا کرم فرما اور بلکہ اپنا ایک مخلص اور ہمدرد سمجھتا تھا مگر مجھے ایک پیغمبر وقت (غلام احمد) کے ہم نام ہونے کا شرف حاصل ہونے کے باوصف اس کا قطعاً علم نہ ہو سکا کہ وہ اپنے دل میں میرے متعلق کسی قسم کے شبہات اور توہمات رکھتے ہیں، دلی سے بمبئی جانے کے بعد ان کا بلا کسی جرم و تقصیر کے میرے خلاف مقدمہ دائر کرنا اور پھر اس حالت میں جب کہ مجھ میں ارتکاب جرم کی بھی کوئی صلاحیت نہیں ان کی عقیدت مندی نہیں تو اور کیا ہے؟ بہر صورت ایک پیغمبر کے ہمنام کے ساتھ ان کی یہ زیادتی کسی ادبی عدالت میں بھی معقول اور مستحسن نہیں قرار دی جا سکتی، پھر ستم بالائے ستم یہ کہ انھوں نے جناب نسیم انہونوی صاحب کو گواہ شد کر کے مقدمہ دائر کیا جس میں میری تین پشتوں سے کوئی آج تک نہیں پڑا، کیونکہ میرے خاندان میں نہ تو کبھی کوئی زمیندار ہوا، نہ کسی کچہری کا اہلکار، نہ تھانے دار اور نہ کسی عدالت کا پیشکار، چنانچہ یہ پہلا مقدمہ ہے جس میں مجھے ماخوذ کیا گیا ہے اور بحیثیت گواہ کے بھی نہیں بلکہ بحیثیت ملزم کے، پھر اللہ اکبر کا مقام ہے کہ مجھ سے اکبر الہ آبادی کے لطائف پر مقدمہ لکھایا جا رہا ہے۔

"دل صاحب اولاد سے انصاف طلب ہے"

بھلا کہاں اکبر الہ آبادی اور کہاں یہ خاکسار — چہ پدی چہ پدی کا شوربہ
الہ آباد اور لکھنؤ کا بعد اور وہاں کے رہنے والوں کے طور طریق، رہن سہن، رفتار گفتار
کا فرق، انسان تو انسان پھلوں تک سے نمایاں، الہ آباد کا امرود اور لکھنؤ کا لکھنوا سفید
مزے میں فرق، رنگ و روغن میں فرق، گٹھلی چھلکے میں فرق، فصل میں فرق درختوں کی
اونچائی پنچائی میں فرق، غرض فرق اور فرق ہی فرق۔

"بہ بیں تفاوتِ رہ از کجاست تا بہ کجا"

ایں افراق و تفریق (افراط و تفریط) کا سلسلہ ذرا ملاحظہ تو فرمائیے، کہاں سے
کہاں تک چلا گیا ہے پھر میں فرقت اور وہ ناظم ہیں نے اگر ان کو کوئی خط نہیں لکھا تو
اپنے تخلص کے ناموس کی حفاظت میں، مگر ان کو تو بحیثیت مدعی کم از کم مقدمہ دائر کرنے
سے پہلے روزنامچہ کی نقل[1] اور نوٹس دینا چاہیئے تھا۔

"گر میں نے کی تھی توبہ ساقی کو کیا ہوا تھا"

پھر جس کو انھوں نے گواہ شہ قرار دیا ہے وہ گواہ بھی خوب ہے جو عین مقدمہ
کی پکار کے وقت صاحبِ فراش، خدا کرے یہ مقدمہ فیل ہو جائے اس سے زیادہ
میں ناظم صاحب کو کیا بد دعا دے سکتا ہوں رہی میری ذات تو اس کے واسطے سے
اس حسنِ ظن پہ ہمسفروں کے ہوں خندہ زن مجھ بے خبر کو رہبرِ منزل بنا دیا

اب رہا لطائف و ظرائف کے بارے میں جیسا کہ میں اپنے ایک مضمون میں لکھ
چکا ہوں کوئی تحقیقاتی مقالہ لکھنا تو فی الحال میرے بس کی بات نہیں اور یہ بتانا
بھی اس وقت مشکل ہے کہ لطیفہ گوئی کی ابتدا کب سے ہوئی؟ کس نے کی؟ اُن
صاحب کا کیا نام اور کیا ولدیت تھی؟ ان کی وضع قطع کیسی تھی؟ ناک بڑی تھی یا

---

[1] نسیم انہونوی صاحب نے بغیر اکبر کے لطائف کا مسودہ بھیجے مجھے لکھا کہ ناظم سیتاپوری صاحب نے مجھے لکھا ہے کہ فرقت صاحب سے مقدمہ لکھوا لیجئے اسکی اطلاع بستر علالت سے نسیم صاحب نے مجھ کو دی۔

چھوٹی؟ ایک کان تھا یا دو؟ ڈاڑھی مونچھوں والے تھے یا کلین شیو؟ اتر دکھن منھ بنا کر ہنستے تھے یا پورب پچھم؟ ہنسنے میں آورد تھی یا آمد؟ سر گھٹا تھا یا انگریزی بال رکھتے تھے؟ مرتے وقت ہنس رہے تھے یا رونی صورت بنائے تھے؟ ان کے والد مرحوم ان کی زندگی میں مر چکے تھے یا صاحبزادے کے مرنے کے منتظر تھے، یہ تمام مصیبتیں اگر جناب نادم سیتاپوری صاحب کو لکھواتا ہوں تو کسی فرصت رکھنے والے باخبر پروفیسر رشید احمد صدیقی قسم کے انسان کے پاس جائیں یہ باتیں وہی بتا سکتے ہیں ورنہ جہاں تک خاکسار کی معلومات کا تعلق ہے اس کے پاس نہ تو دنیا کا سب سے پہلا فوقی پیدائش کا کوئی رجسٹر ہے جس میں دیکھ کر مذکورہ بالا حالات فراہم کرے اور نہ لطائف وظرائف کی کوئی مستند تاریخ جس میں لطائف وظرائف کے تاریخی ارتقاء سے بحث کی گئی ہو یا اس کے بارے میں تفصیلات درج ہوں خاکسار کا ذاتی خیال تو یہ ہے کہ حضرت انسان کا وجود میں آنا ہی ایک لطیفہ تھا ورنہ خیال فرمائیے کہ باوجود اتنی تاکید کے ایک انسان کا گندم کھا لینا اور اتنا بڑا انسان ہو کر اس کا شیطان کے چکر میں آجانا اور ہم کو آپ کو لطیفہ گوئی کی مصیبت میں مبتلا کرنا کیا معنی رکھتا ہے؟ پھر ایک برگزیدہ فرشتے کا آدم کے پتلے کے سامنے سر نیاز خم کرنے سے انکار کرنا، گویا ڈپٹی کمشنر سے براہ راست چپراسی کا عہدہ قبول کر لینا، آپ ان تمام باتوں کو ایمانداری سے بتائیے کیا کہیں گے۔ اس واقعہ کے بارے میں اگر آپ کسی علی گیرین سے پوچھیں تو وہ چھوٹتے ہی کہہ دے گا کہ شیطان نے آدم کے ساتھ اینٹی ڈی کی تھی علی گڑھ میں اینٹی ڈی کی اصطلاح بعض معنوں میں مستعمل ہے پھر حضرت آدم کا خلد سے نکلنا اور بی حوا کی معرفت کچکچا کر دنیا کی آبادی میں اضافہ کرنا، قسم قسم کے انسانوں کو پیدا کرنا، ہنسوڑ، قنوطیت پسند، گوشہ نشین، رند، آزاد منش، ملحد، مرتد، کافر، دیندار، خدا رسیدہ، برگزیدہ، افسردہ، آشفتہ، شیفتہ، تفتہ، جگر خستہ، یاوہ باش، زندہ دل

وغیرہ وغیرہ یہ سب لطیفہ نہیں تو اور کیا ہے؟ میری دانست میں تو لطیفہ گوئی کا آغاز اسی واقعہ سے ہوتا ہے، اس کے بعد انھیں ذریات میں دنیا کے سارے لطیفہ گو، مرثیہ گو، داستان گو، تاریخ گو اور کتنے کم اور گو (come and go) اور زود گو کا دنیا میں آنا جانا اور چراغ سے چراغ جلاتے چلا جانا لطیفہ گوئی کا آغاز اور ارتقا سب ہی کچھ ہے۔

جہاں تک اکبر الہ آبادی کے بذلہ سنج، نغز گو اور طنز نگار ہونے کا تعلق ہے وہ اس دنیا میں اکبر تھے کیونکہ نہ تو پچھلے اکابرین ادب میں ان کا کوئی ہم پلہ ہوا اور نہ آئندہ نسلوں میں کوئی ان کے رنگ کو اختیار کر سکا۔ وہ اپنے رنگ کے موجد بھی تھے اور خاتم بھی، عبد بھی تھے اور معبود بھی، خالق بھی تھے اور مخلوق بھی اور یہ کہنا بالکل درست ہے کہ اردو شاعری کا اگر ابتدا سے جائزہ لیا جائے تو ان سے پہلے ساری ظریفانہ شاعری ہجو کے علاوہ کسی اور شکل میں کسی خاص اہمیت کے ساتھ نظر نہیں آتی، غزل قصیدہ وغیرہ میں بھولے بھٹکے مزاح، تمسخر یا پھبتی وغیرہ کا کوئی جزو تو کہیں کہیں مل جاتا ہے مگر نہ تو تسلسل کے ساتھ ملتا ہے اور نہ اس لطافت کے ساتھ جو اکبر نے پیش کی انھوں نے اپنے خیالات کو بغیر سوچے سمجھے عمل کا جامہ نہیں پہنایا بدلتے ہوئے زمانے کو ایک نئی روح اور نئے انداز سے ہوشیار کرنے کا ارادہ شعوری تھا، ان کے اکثر اشعار کے پس پشت کوئی نہ کوئی لطیفہ ضرور ہوتا تھا، وہ ظرافت کو ایک خاص اہمیت اور روک تھام کے ساتھ پیش کرنا چاہتے تھے وہ اس کو محض تفریحات کے خانے میں ڈال دینا نہیں چاہتے تھے چنانچہ ان کے بعض مشہور اشعار کی مصاحبت کرتے ہم کو چند لطائف ملتے ہیں مثلاً

عاشقی قید شریعت میں جب آجاتی ہے
جلوۂ کثرتِ اولاد دکھا جاتی ہے

ایک مرتبہ دوست احباب کا مجمع تھا ایک صاحب تشریف لائے دوستوں میں سے کسی نے مخاطب ہو کر کہا کہ حضور آپ نے یہ بھی سنا کہ ان کے گھر پانچواں بچہ پیدا ہوا ہے یہ سن کر تمام طرف سے شیرینی کا مطالبہ ہوا، اس پر آپ نے فرمایا کہ نہیں، ان سے کچھ نہ طلب کرو، یہ انھیں زوجہ کو بہ زمانۂ عشق اپنا سارا اثاثہ نذر کر چکے ہیں، دیکھو! میں نے انھیں کی مثال سے کیا اچھا شعر کہا ہے۔

عاشقی قید شریعت میں جب آجاتی ہے
جلوۂ کثرتِ اولاد دکھا جاتی ہے

اسی طرح ان کے زمانے میں کلکتہ کی گوہر جان اور الہ آباد کی جانکی بائی کا طوطی بول رہا تھا، گراموفون کے ہر ریکارڈ کے آخر میں یہی سنائی پڑتا "میں ہوں جانکی بائی الہ آباد" چنانچہ کچھ لوگوں نے ایک مرتبہ اُن سے گوہر جان کے گانے، اس کی دولتمندی عزت اور شان و شوکت کی تعریف کی تو فرمایا۔

کون آرام سے دنیا میں ہے گوہر کے سوا
سب کچھ اللہ نے دے رکھا ہے شوہر کے سوا

آخر میں یہ عرض کردوں گا کہ زندگی میں تو اکبر الہ آبادی نے اردو شعر و ادب پر احسان کیا ہی مگر مرنے کے بعد بھی وہ مزاح نگاروں پر ایک عظیم احسان فرما گئے۔ اور وہ اس طرح کہ انھوں نے اپنا کوئی خلیفہ[1] نہیں چھوڑا ورنہ ہم لوگوں میں ان کی جانشینی اور خلافت کا جھگڑا شروع ہو جاتا اور جس طرح کا ایک مذہبی لطیفہ ابھی چند سال قبل شیعہ، سنی ہنگامہ کی صورت میں لکھنؤ میں ہو چکا ہے جس میں مذاق ہی مذاق میں چند معصوم گنہگار نذر اجل ہوئے اسی طرح اردو ادب کے مزاح نگاروں

---

[1] اکبر الہ آبادی کی ایک بیوی شیعہ اور ایک سنی تھیں۔

میں مدح اکبر اور قدح اکبر کا سلسلہ چلتا اور مصحفی اور مصحفاً والی براتیں نکلنا شروع ہوتیں جس میں خاکسار بھی کسی گوشے میں مار کھاتا اور اکبر کے لطائف وظرائف کا عنوان بنا دکھائی پڑتا۔

غلام احمد فرقت کاکوروی
پہاڑی بھوجلہ ـــ دلی
مورخہ ۲۵ فروری ۵۵ء

(١)

جس زمانے میں اکبر نے آزادیٔ نسواں اور بے پردگی کے خلاف جہاد شروع کیا؟ ترقی پسند خواتین اور اسی قسم کے مردوں نے ان پر بوچھار شروع کردی، لاہور کا "تہذیب نسواں" ان سب میں پیش پیش تھا، اکبر کے خلاف بہت سے مضامین شائع کئے گئے اور "آصف جہاں بیگم" نے صاف صاف کہا کہ یہ آنے والا طوفان اب کسی کے روکے نہیں رک سکتا، اکبر خود بھی اسے تسلیم کرتے تھے اور جانتے تھے کہ ہوا کا رخ کس طرف ہو رہا ہے، پھر بھی ان دھمکیوں سے مرعوب ہونے کے لئے تیار نہ تھے کہا ہے

اکبر دبے نہیں کسی سلطاں کی فوج سے
لیکن شہید ہوگئے بیگم کی نوج سے

(٢)

کاتبوں کی "غلط نوازیوں" سے بہت دل برداشتہ خاطر رہتے تھے۔ مولانا ظفر الملک علوی اڈیٹر ماہنامہ "الناظر" کو ایک خط (مطبوعہ الناظر۔ یکم جنوری ١٩١٠ء) میں تحریر فرماتے ہیں۔

"اپنے مسودات خود نہیں پڑھ سکتا۔ کاتب کو ہدایت میں نہایت دقت ہوتی ہے۔ کاتب صاحب ایسے "ذی استعداد" ہیں کہ کونسلوں میں سیٹ کو "گھونسلوں میں بیٹ" لکھ دیتے ہیں۔"

پھر اسی خط میں پردہ کی بحث چھیڑتے ہوئے لکھا ہے۔

"تعلیم نسواں کا مخالف میں کیونکر ہو سکتا ہوں۔ بغیر تعلیم کے "معشوقانہ انداز" ممکن نہیں۔ میں تو شاعر آدمی ہوں اس قدر تعلیم چاہتا ہوں کہ شعر کا سلیقہ پیدا ہو جائے "سبز پری" اگر ایسا مطلع نہ کہہ سکتی۔

معمور ہوں شوخی سے شرارت سے بھری ہوں
دھانی مری پوشاک ہے میں سبز پری ہوں

تو "گلفام" کی کیا کم بختی تھی کہ اس پر مرتا اور راجہ اندر کی سختیاں اٹھاتا"

(۳)

سنہ ۱۹۲۱ء میں جب اکبر مرض الموت میں مبتلا ہو چکے تھے۔ ایک دوست عیادت کے لیئے آئے، مرض کی شدت کی وجہ سے اٹھنا بیٹھنا دشوار تھا مگر طبیعت کا چلبلاپن نہیں رک سکے کہنے لگے۔

میرے پاس یہ لڑکا جو نوکر ہے بڑا ہی وضع کا پابند ہے کل میں نے ایک سیب منگوایا تھا وہ بھی چھ پیسے میں لایا اور آج ایک ناشپاتی بھی چھ پیسے کی لایا۔ میں نے کہا بھائی کیا اندھیر مچا رکھا ہے، کیا راج چوپٹ کرے گا۔

یہ کہہ کر بے اختیار ہنس پڑے اور کہنے لگے اب تو کمزوری کی وجہ سے ہنسا بھی نہیں جاتا۔

آرام کی تلاش نے رکھا ہے بے قرار
ہر خواہش سکون سبب اضطراب ہے

اسی وقت ایک دوسرے صاحب مزاج پرسی کے لیئے آ گیے۔

پوچھا آپ دوا کس کی پی رہے ہیں۔؟

میں دوا کا زیادہ قائل نہیں ہوں، بیماری اپنا کورس پورا کر کے خود چلی جاتی ہے۔

طبیبوں کو تو اپنی فیس لینا اور دوا دینا
خدا کا کام ہے فضل و کرم کرنا شفا دینا

(۴)

ایک صاحب ذوق نے اکبر کو لکھا ——

"میں صاحب ذوق ہوں، آپ کی الہامی شاعری کا پرستار اور دالہ وشیدا، اتنی استطاعت نہیں کہ آپ کے دیوان یا کلیات کو خرید کر پڑھ سکوں، اس لیئے ازراہ علم دوستی اپنے دیوان کی ایک جلد بلا قیمت مرحمت فرما کر ممنون فرمایئے۔

خط دیکھ کر کہنے لگے ـــ
اور سنیے ـــ آج مفت دیوان طلب فرما رہے ہیں، کل فرمائش کریں گے کہ صاحب ذوق ہوں مفت میں "جانکی بائی" کا گانا سنوا دیجیے۔

(۵)

اکبر کو جملوں کے مذاق میں بھی اچھا خاصا دخل تھا اپنے اس مصرعہ کی۔

پہلے بی، اے تھے اور اب بیمار ہیں

تشریح کرنے لگے، فرمایا اگر "بیمار" کے "بی" (B) کو (BEE) یعنی شہد کی مکھی سمجھ لو اور مار کو "مار" ہی رہنے دو تو مصرعہ کے معنی بالکل صاف سمجھ میں آسکتے ہیں یعنی بی، اے پاس کرنے کے بعد آج کل کے نوجوان بیچارے مکھی مارتے رہتے ہیں۔

(۶)

جملوں کا مذاق ـــ حرفوں میں الفاظ کا الٹ پھیر اور کمی بیشی اکبر کی "ملبندئی نکمہ" کا ایک خاص مشغلہ تھا، آزادی کی بحث چھڑ گئی کہنے لگے ـــ "بالکل غلط انسان آزاد ہی نہیں، یہ سانس لینا ایک قید اور پابندی ہے انسان کے لئے ـــ اگر "آدم زاد" سے "دال" اور "میم" کے الفاظ نکال کر اس کا "دم" نکال دیا جائے تب ہی وہ آزاد ہو سکتا ہے، نباتات کا بھی یہی حال ہے جب تک سر نہ کٹے "آزاد" نہیں ہوتے مثلاً (TREE) (پیڑ) کا سر کاٹو (T) ٹی، الیف (F) بن جائے گا اس کے بعد REE کے ساتھ ملاؤ تو (FREE) فری ہو جائے گا یعنی آزاد۔

(۷)

شاہ دل گیر صاحب کا خط آیا، انھوں نے شکایت کی کہ میرے خط کا جواب نہیں دیا ـــ اور کچھ غیر مطبوعہ اشعار بھی مانگے، کچھ منتخب اشعار لکھوا کر بھجوا دیئے اور سب سے آخر میں یہ شعر بھی۔

یہ پرچہ جس میں چند اشعار ہیں ارسال خدمت ہے
ہمارے تختۂ دل ہیں آپ کا مالِ تجارت ہے

(۸)

ایک صاحب نے شاید اپنی گھڑی ملانے کے خیال سے اپنی گھڑی دیکھتے ہوئے پوچھا
کیا بجا ہوگا ؟ ذرا گھڑی تو دیکھئے۔

اکبر نے کہا۔

اس کے لئے گھڑی دیکھنے کی کیا ضرورت! میں یونہی بتائے دیتا ہوں، میں نے عصر کی نماز ساڑھے چار بجے پڑھی تھی، اس وقت سے ابتک تین مرتبہ پیشاب کے لئے جا چکا ہوں اور پیشاب کے لئے ہر آدھ گھنٹے کے بعد مجھے جانا پڑتا ہے، اس حساب سے اس وقت چھ بجے ہیں، اس کے بعد کہنے لگے ؟

اس سلسلہ میں ایک لطیفہ بھی سن لیجئے۔ ایک شکاری شکار سے واپس ہو رہا تھا، راستے میں دھوبیوں کا گھاٹ پڑا، شکاری نے ایک دھوبی سے پوچھا "کیا وقت ہوگا؟" دھوبی نے جواب دیا میرا گدھا بارہ بجے کی توپ دغنے کے بعد سے ابتک صرف دو مرتبہ "رینگا" ہے، اس کی عادت ہے کہ ہر آدھ گھنٹے کے بعد "رینگتا" ہے، اس حساب سے اب ایک بجا ہے۔ چنانچہ جب گھڑی دیکھی گئی تو واقعی ایک ہی بجا تھا۔

یہ لطیفہ بیان کر کے بولے۔

ایک لطیفہ اور یاد آگیا، ایک شیخ صاحب کو چاند کی پہلی تاریخ دورہ پڑا کرتا تھا۔ ایک مرتبہ لوگوں میں "رویت ہلال" کے بارے میں اختلاف ہوگیا، ایک صاحب نے اس کا حل یہ سوچا آپس میں لڑنے جھگڑنے سے اچھا یہ ہے کہ شیخ صاحب کو جا کر دیکھ لو، اگر ان پر دورہ پڑ گیا ہو تو چاند ہے ورنہ نہیں!

(۹)

بمبئی تشریف لے گئے، کرافورڈ مارکیٹ کے قریب شاہ جہاں ہوٹل میں قیام
فرمایا، ہوٹل کے مالک سید فضل شاہ مرحوم نے انھیں ہندوستان کی ایک عظیم المرتبت
شخصیت سمجھتے ہوئے ان کی خاطر مدارات اور آرام و آسائش میں کوئی کمی نہیں ہونے دی
جس دن بمبئی سے روانہ ہو رہے تھے شاہ صاحب نے مودبانہ عرض کیا۔
"اور حضور نے اپنے شاہجہاں ہوٹل پر کچھ کہا ہی نہیں، یہ ہوٹل بیچارہ کیا کہے گا کہ یہاں
اکبر الہ آبادی ٹھہرے تھے آکر۔۔!
ہنسنے لگے ۔۔ بولے!
"بہتر ہے ہوٹل کو شکایت کا موقع نہیں پیدا ہوگا، چلتے وقت نظم لے لیجئے گا۔
سامان سفر بندھ رہا تھا، احباب بھی ملاقات کے لئے آرہے تھے اور نظم بھی کہی
جا رہی تھی، روانہ ہونے سے پہلے ہی یہ نظم شاہ صاحب کو دے دی"

ہے ہوٹلِ شاہجہاں، راحت رسانِ مُسلماں
کیسا ہی مضطر کیوں نہ ہو، دل خود ٹھہر جاتا ہے یاں
کمرے بہت آراستہ، منظر نہایت خوش نما
راحت کا کُل ساماں درست، اچھی غذا اچھی ہوا
بازار بھی نزدیک ہو اور ریل بھی ہے متصل
خادم بھی اجلے مستعد، اور واجبی ہو یاں کا بل
تعمیر عالی شان ہے، ہر طرح کا سامان ہو
پنکھا ہو یا ہو روشنی دونوں میں برقی جان ہو
ہر طرح کا آرام ہے اور جلوۂ اسلام ہے
اچھی یہاں کی صبح ہو دلکش یہاں کی شام ہے

ممدوح پبلک ہیں بہت بے شبہ "مسٹر شاہ" ہیں
اخلاق ان کے خوب ہیں ذی علم ہیں ذی جاہ ہیں
باتیں بہت دلچسپ ہیں، طینت محبت سے بھری
گو اہلِ ہوٹل ہیں بہت، ان کو ہے سب میں برتری
از ہیبت شاہجہاں لرزد زمین و آسماں
از ہوٹلِ شاہجہاں آرام بائد یک جہاں

(۱۰)

حکومت حجاز نے ایک برطانوی کمپنی کو "حجاز لائن" تعمیر کرنے کا ٹھیکہ دیا، تجویز یہ تھی کہ جدہ سے مکہ معظمہ تک ریل نکال کر حاجیوں کی سفری مشکلات کا خاتمہ کر دیا جائے۔

اکبر نے جب اس خبر کو سنا توان کی جولانی طبع نہ رک سکی فرمانے لگے۔

کعبے تک ریل کا سامان ہوا چاہتا ہے
اب تو انجن بھی مسلمان ہوا چاہتا ہے

(۱۱)

جوانی میں اکبر نے بھی شاہدانِ بازاری سے کافی دلچسپی لی اور اس زمانے میں بڑے آدمیوں کے لئے ایک فیشن سا تھا کہ کوئی طوائف ان سے منسوب ہو۔! اکبر کی جوانی بھی اس "زندی" سے اپنا دامن نہ بچا سکی جس کا اعتراف خود اکبر نے فرمایا ہے کہ۔

عیاش ہوں، قلبتان نہیں ہوں

انھیں دنوں الہ آباد کی مشہور طوائف امامن کے قدر دانوں میں ایک مسلمان ڈپٹی کلکٹر بھی تھے، اور چاہتے تھے کہ "امامن" صرف انھیں کی ہو کر رہ جائے۔ لیکن

اکبر کے رنگ کو کسی طرح وہ اکھاڑ نہ سکے تو جھنجھلا کر اکبر کا تبادلہ الہ آباد سے کرا دیا۔
امامن کی جدائی رقابت کا زور اکبر کے داغِ دل پھپھولے بن کر پھوٹ پڑے،
فرماتے ہیں!

عزیزوں کی محبت ہم نشیں کی یاد سے چھوٹے
"امامن" کی اداہائے ستم ایجاد سے چھوٹے
.... کی ایک دخترِ نوزاد سے چھوٹے
"میاں کھجو" کی فرمائش سے اور ارشاد سے چھوٹے
الہ آباد ہم سے، ہم الہ آباد سے چھوٹے

(۱۲)

اکبر کو "رسمی بازدید" کی ملاقاتوں سے اللہ واسطے کا بیر تھا۔ ان سے یہ شکایت عام طور پر سب کو رہتی، مگر اکبر جیسا "خلوص مشرب" دل لے کر دنیا میں آئے تھے وہ ان دنیوی تکلفات پر موم نہ ہو سکا، وہ اسے اپنی کمزوری تسلیم کرنے کے لئے کبھی تیار نہ تھے، فرماتے ہیں۔

خلق مجھ سے طالب پابندیٔ اخلاق ہے
میری یہ حالت کہ مجھ پر "تھینک یو" بھی شاق ہے

(۱۳)

پریاواں (ضلع پرتاب گڈھ) تشریف لے گئے، فصلی سال شروع ہو رہا تھا ان کے ہمدمِ بھی خان بہادر نواب شیخ احمد حسین صاحب مرحوم تعلقدار پریاواں اپنی ریاست کے کاغذات مرتب کرا رہے تھے، یہ زمانہ ہوش مند زمینداروں اور تعلقداروں کے لئے خاص اہمیت رکھتا تھا، کاشتکاروں سے محاصل لگان وصول کرنے کے لئے "جمع بندی" بنوائی جاتی تھی اور پھر ان سے "کھاتے داتے" بنا کرتے تھے، یہ

"غیر شاعرانہ مشاغل" اور "زمیندارانہ ماحول" اکبر کے بس کا روگ نہ تھا، وہ تو ہمیشہ سے یہی کہتے چلے آئے تھے۔

"عافیت یہ ہو کہ انسان زمیندار نہ ہو"

چند ہی روز میں گھبرا اٹھے، شیخ صاحب سے کہتے کیا؟ ان کی سال بھر کی روٹیوں کا معاملہ تھا ___ اور کہا بھی تو اس طرح پر کہا۔

شیخ صاحب جمع بندی میں نہ کیوں الجھے رہیں
ہند کا اسلام ہی کھیوٹ میں داخل ہو گیا

نواب صاحب فرماتے تھے، میں نے بہت روکا مگر نہ رکے، کہنے لگے اب تو اجازت ہی دیجئے انشاء اللہ پھر حاضر ہوں گا۔

(۱۴)

اکبر کی خدمت میں ہر وقت حاضر رہنے والے ایک صاحب جو کافی "خوش خوراک" تھے اور اسی "زیستن برائے خوردن" نے انھیں معدے کا مستقل مریض بنا دیا تھا آئے دن پیٹ کی بیماریوں میں مبتلا رہتے ایک روز کچھ پریشان اور مضمحل سے آئے، اکبر نے پوچھا "کہو بھئی کیا حال ہے؟"

کچھ آبدیدہ ہو کر بولے۔

"اب تو زندگی سے بیزار ہو چکا ہوں روز روز کی بیماریوں سے کھانے پینے کا لطف جاتا رہا۔ زندگی بے کیف اور بے مزہ سی ہو گئی ہے اب۔

ایک لمحہ خاموش رہے اکبر، پھر ٹھنڈی سانس بھر کر کہنے لگے۔

"ہاں بھئی سچ ہے"

زندگی سے میرا بھائی سیر ہے
پھر بھی خوراک اُس کی ڈھائی سیر ہے

(۱۵)

ایک صاحب جو اکبر مرحوم کے دور کے عزیزوں میں تھے تشریف لائے، شب برات کا موقع تھا ـــــ اکبر نے پوچھا۔

آج کدھر بھول پڑے ـــــ؟

انھوں نے جواب دیا ـــــ شب برات کا تحفہ لینے کے لئے آیا ہوں، سن کر کچھ دیر خاموش رہے پھر فرمایا۔

تحفۂ شب برات کیا تمھیں دوں ؟
جان من تم تو خود پٹاخہ ہو

(۱۶)

ایک کافی سن رسیدہ مگر "فیشن ایبل بزرگ" ایک مرتبہ بناؤ سنگھار میں مصروف تھے ـــــ اکبر کے ہم سن اور بے تکلف دوست تھے، مگر اکبر کو دیکھ کر جھیپ ہی گئے۔ اکبر ایسے موقع پر کب چوکنے والے تھے کہنے لگے مسکرا کر؟

مصروف ہیں حضور یہ کس بندوبست میں
اپریل کی بہار نہ ہوگی اگست میں

(۱۷)

حضرت اکبر کے پاس ہر وقت بیٹھنے اٹھنے والے ایک صاحب ایک دن مسکراتے ہوئے آئے تو معلوم ہوا کہ آپ نے دنیا کی بڑھتی ہوئی آبادی میں ایک اور اضافہ فرمایا ہے! چار بچے پہلے ہی سے موجود تھے اور اب یہ پانچویں اولاد تھی ـــــ سب لوگ ہنس ہنس کر مٹھائی طلب کر رہے تھے اور اکبر کو ان کی "کثیر العیالی" اور بے بسی پر ترس آرہا تھا کیونکہ یہ بیچارے اپنے مولی ہتوں، پہلے ہی کھا رہی تھے، اکبر کہنے لگے بھائی انھیں مت ستاؤ، یہ بیچارے اپنی زوجہ پر پہلے ہی اپنا سب کچھ لٹا چکے ہیں اور اب

ان کی یہ حالت ہو رہی ہے۔

عاشقی قیدِ شریعت میں جب آجاتی ہے
جلوۂ کثرتِ اولاد دکھا جاتی ہے

(۱۸)

روپیہ کو "چھوٹا مشکل کشا" کہتے ہیں، جس طرف دیکھیے، جہاں جائیے، بس ایک ہی صدا ہے۔ روپیہ، روپیہ، روپیہ بزمِ اکبر میں بھی ایک دن اسی "زر پرستی" کا ذکر چھڑ گیا، کہنے لگے بھئی اس سے کون انکار کر سکتا ہے کہ آج کی دنیا میں زر کی طاقت سب سے بڑی طاقت سمجھی جاتی ہے میں نے تو کھلے لفظوں میں اس کا اقرار کیا ہے۔

بے سود اشعار اور کبت ہوتے ہیں
مفلس سے کہاں وہ ملتفت ہوتے ہیں
کرتے ہیچ تو عشق کے اکھاڑے میں ہزار
یہ بت تو بزور "زر" ہی چت ہوتے ہیں

(۱۹)

اکبر بحیثیت "اکبر" سارے ہندوستان میں مشہور ہو چکے تھے ہر سوسائٹی اور ہر ادبی مجلس میں اکبر کا کلام ایک "نوید زندگانی" سمجھا جاتا تھا چنانچہ بہت سے لوگوں نے اپنے آپ کو ان کا شاگرد مشہور کرنا شروع کر دیا، ایک صاحب زیادہ "روشن ضمیر" تھے انہوں نے سوچا بیٹا بن کے تو سبھی کھا لیتے ہیں باپ بن کر کھانے میں مزہ ہی کچھ اور ہے — چنانچہ انھوں نے اکبر کی استادی کا دعویٰ شروع کر دیا، اکبر کو جب یہ اطلاع پہونچی کہ حیدرآباد میں ان کے ایک استاد کا ظہور ہوا ہے تو ایک دن کہنے لگے۔

"ہاں مولوی صاحب کا ارشاد صحیح ہے۔ مجھے یاد پڑتا ہے میرے بچپن میں ایک مولوی صاحب الہ آباد میں تھے

وہ مجھے علم سکھاتے تھے اور میں ان کو عقل۔ مگر دونوں

ناکام رہے۔ نہ مولوی صاحب کو عقل آئی اور نہ مجھکو علم۔"

(۲۰)

جیسے جیسے کلام اکبر مقبول ہوتا گیا، اکبر کی شہرت اور ناموری کو چار چاند لگتے گئے۔ ہندوستان کے ہر حصے سے لوگوں نے دستِ بیعت بڑھایا، اصلاح کے لئے اپنا کلام بھیجنا شروع کیا، شاگردی کی سعادت حاصل کرنا چاہی، ایک صاحب نے تو غضب ہی کر دیا ایک ساتھ بہت سی غزلیں اصلاح کے لئے بھیج دیں مرحوم خرافات کا یہ پلندہ دیکھ کر چیں بجبیں ہی تو ہو گئے کہنے لگے "ان لوگوں نے مجھے بے کار سمجھ رکھا ہے، اصلاح کرنا اپنی جگہ پر ایک مستقل فن ہے جس میں کافی محنت اور دماغ سوزی کرنا پڑتی ہے اور وہ بھی بے سود۔ معاوضہ کچھ بھی نہیں"۔

تھوڑی دیر سوچتے رہے پھر یہ شعر پڑھا۔

اب تو نقدی سے کوئی صاحب مرا دل خوش کریں

سن چکا ہوں آفریں بھی مرحبا بھی داد بھی

پھر بولے۔۔۔ اگر ان غزلوں کے ساتھ کم از کم دس روپیہ کا نوٹ نکلتا تو خیر یہ دردِ سری بھی کوئی بات تھی۔

(۲۱)

ایک دن ایک موٹا سا گاڑھے کا تہمد باندھے بیٹھے تھے۔ حاضرین کا اچھا خاصا مجمع تھا، مختلف موضوعات پر گفتگو ہو رہی تھی، اتفاق سے مچھر نے زور سے پاؤں میں کاٹ لیا نوکر سے پیر کھجانے کو کہا اور وہ آہستہ آہستہ کھجانے لگا، کھجاتے کھجاتے اتفاق سے اس کا ہاتھ گھٹنے کے قریب ایک گلٹی پر پڑ گیا نہ جانے کیا سمجھا وہ۔۔۔ بے اختیار اس کے منھ سے نکلا۔

"اُے ہے ۔ ؟"
نوکر کے منھ سے آواز نکلتے ہی خود بھی چونک پڑے۔

اُے ہے ۔۔ ؟

لازم نے پوچھا ۔۔ کیا سرکار گٹھی دکھ گئی

بولے ۔۔

"نہیں تو مگر تو نے اُے ہے، کہا تو میں سمجھا گلٹی دکھ گئی ہوگی۔ اسی لئے میں نے بھی "اُے ہے" کہہ دیا۔

اکبر کی سنجیدہ ظرافت پر لوگ کھلاکر ہنس پڑے۔

(۲۲)

ایک صاحب نے ایک بڑی ڈبل روٹی پیش کی لاکر
ڈبل روٹی کا اوپری حصہ آنچ کی تیزی سے کچھ کھرا ہوگیا تھا۔ اتنی بڑی ڈبل روٹی دیکھ کر بہت خوش ہوئے کہنے لگے۔

"اتنی بڑی ڈبل روٹی ۔۔ یہ تو اچھا خاصا کسی یوروپین کا پچھلا حصہ ہے مگر وہ گورا ہوتا ہے یہ ذرا سانولا ہے سنیے، ایک شعر یاد آگیا۔

کاش کر لے مجھے وہ شاہد ہوٹل منظور
کیک تو روز ہے اک روز بنتجن ہی سہی

(۲۳)

ایک دن حاضرین سے فرمانے لگے۔

ہماری یہ بڑی نادانی ہے کہ ذرا ذرا سی بات پر اپنی بڑائی اور فوقیت جتانے لگتے ہیں، انتہا پسند کہتے ہیں ہم اچھے ۔ اعتدال پسند کہتے ہیں ہم، علی گڑھ والے اپنی بڑائی کرتے ہیں اور ندوے والے اپنی حالانکہ حقیقت دیکھو تو برطانوی معدے میں "کیلوس" بن رہے

ہیں، بالکل وہی حالت ہے جو مختلف غذاؤں کی — انسان کے پیٹ میں ہوتی ہے گیہوں کہتا ہے میں اچھا ہوں، چاول کہتا ہے میں، فیرینی کہتی ہے میں سب سے اچھی ہوں اور لڈو کہتا ہے میں مزیدار ہوں ان سب کی باتیں سن کر معدہ مسکرا کر کہتا ہے — رات بھر جو چاہے کہہ لو، جتنی "خود ستائی" جی میں آئے کرلو، صبح کو تم سب کا حشر ایک ہی ہو گا "حلال خور" آکر ایک ہی ٹوکرے میں سمیٹ لے جائے گا سب کو۔

کہوں کس کو یہ وقعت میں زیادہ اور یہ کم ہیں
ہر اک ذرّے کو دعویٰ ہے کہ ہم بھی جزو عالم ہیں

(۲۴)

ایک دفعہ اکبر بہت سخت بیمار ہوئے۔ جگر کی خرابی کی وجہ سے کھانا ہضم نہیں ہوتا تھا بہت ہی کمزور ہو گئے، حکیموں نے تجویز کیا کہ آپ اونٹنی کا دودھ پیا کیجیے۔ مسکرا کر کہنے لگے۔ "اس بڑھاپے میں جگر کی خرابی مجھے شیر خوار بنا رہی ہے ماں باپ نے بچپن ہی میں غلطی کی — اگر کسی "دراز قامت" انا کا دودھ پلوا دیتے تو آج یہ اونٹنی کا دودھ کیوں تلاش کرنا پڑتا، بہرحال اگر اونٹنی کا دودھ مل گیا تو ضرور پیوں گا، اللہ مالک ہے۔

اگر کچھ زندگی باقی ہے اچھا ہو ہی جاؤں گا
وگرنہ جس طرح سب سو گئے ہیں سو ہی جاؤں گا

(۲۵)

انیسویں صدی کے آخر میں ہندوستان "پریس" اور "پبلسٹی" سے کافی روشناس ہو چکا تھا، "اشتہار بازی" اور "ایڈورٹائزمنٹ" کے نئے تجربات سب سے پہلے پنجاب اور دہلی کے دوا فروشوں نے شروع کیے تھے بنگال بھی کچھ زیادہ پیچھے نہیں تھا لیکن اردو زبان میں تھوڑی بہت "اشتہار بازی" کلکتہ میں رائج ہو گئی تھی، "جنسی امراض" کے کوک شاسترانہ اشتہارات عام طور پر اخباروں میں چھپنے لگے تھے اور بیسویں صدی کے شروع میں تو اشتہار بازی

نے وبائی شکل اختیار کر لی تھی۔ مرنے سے دس پندرہ برس پہلے اکبر دائم المریض ہو چکے تھے، پیٹ کی بیماریوں نے کافی کمزور بنا دیا تھا ایک صاحب ملنے کے لیے آئے، بیماری کا حال سن کر دہلی کی ایک اشتہاری دوا تجویز کر دی — انھیں کیا معلوم تھا کہ یہ اشتہاری دوائیں اکبر کی چڑھ ہیں کہنے لگے —

آپ کو نہیں معلوم — میں نے تو انھیں اشتہاری دواؤں کی وجہ سے اخبارات کھولنا تک چھوڑ دیا، پڑھنا تو درکنار — مجھے تو ان اخبارات سے نفرت سی ہو گئی ہے، آپ نے میرا یہ شعر سنا نہیں شاید۔

مجھے بھی دیجیے اخبار کا ورق کوئی
مگر وہ جس میں دواؤں کا اشتہار نہ ہو

(۲۶)

۱۹۲۱ء میں جب اکبر مرض الموت میں مبتلا تھے ان کے ایک دوست میر سجاد علی نے مشاعرے میں شرکت کے لئے دعوت نامہ بھیجا اور ساتھ ہی "رساول" کی ایک ہانڈی بھی! اکبر نے خط کا جواب لکھوایا، بیماری کی وجہ سے مشاعرے میں شرکت سے معذور ہوں، لیکن مشاعرے کی طرح پر غزل ارسال خدمت ہے، مطلع تھا۔

ہو بیاں کیوں کر عنایت حضرتِ سجاد کی
لذتیں لوں گا میں آروغِ "رساول زاد" کی

(۲۷)

اکبر وضعداری کے ساتھ روزانہ شام کو اپنے ایک ڈپٹی کلکٹر دوست کے یہاں جایا کرتے تھے جہاں ان کے لئے علیحدہ ایک حقہ بھروا کر رکھ دیا جاتا تھا اور شغل فرمایا کرتے تھے۔ حسب معمول ایک دن جو پہونچے تو "ڈارون" کے جد امجد پر بحث ہو رہی تھی۔ خود صاحب خانہ اس بحث میں اتنا محو تھے کہ اس میں یہ بھی خیال نہ آیا کہ اکبر آ گئے ہیں ان کے لئے حقہ

بھر دادیا جائے۔

خاموشی کے ساتھ اکبر کچھ دیر تک بیٹھے ہوئے اس بحث کو سنتے رہے — مگر جب دیکھا کہ بحث ختم ہی نہیں ہوتی تو "شریک مباحثہ" ہوتے ہوئے بولے۔

بھائی بندر کچھ کر سکتا ہے یا نہیں؟ یہ تو ایک علیحدہ بحث ہے البتہ اتنا میں بھی جانتا ہوں کہ بندر حقہ نہیں پیتا۔

"حسنِ طلب" کے اس انوکھے انداز پر صاحب خانہ چونک پڑے اور اپنے ملازم کو آواز دی کہ حقہ لے آنا۔!

(۲۸)

جس زمانے میں اکبر آگرہ میں وکالت کر رہے تھے ان کے ملنے والوں میں ایک صاحب نے آگرہ کی مشہور صنعت "جوتا سازی" کا کاروبار شروع کر دیا۔ اس وقت تک "کسب معاش" کے طور پر بھی ایسے پیشوں کو سوسائٹی نے اچھی نگاہ سے نہیں دیکھا تھا — "پھر" وہ "حضرت" تھے بھی کچھ زیادہ "سخالص" قسم کے آدمی — حسب نسب کا غرہ خواہ مخواہ شرافت کا پروپیگنڈہ۔ اور بات بات میں خاندانی بڑائی کا دعویٰ۔ اکبر کو ان کا یہ "تضادِ زندگی" ایک آنکھ نہ بھایا۔ تین شعر کہہ کر اپنی بات بھی کہدی اور ان کی افتادِ طبیعت کے تقاضے کو پورا کرتے ہوئے ایک دلچسپ تاویل بھی۔

شو میکری شروع ہے کی اک عزیز نے
جو سلسلہ ملاتے ہیں "بہرام گور" سے
پوچھا کہ بھائی تم تو تھے تلوار کے دھنی
مورث تمہارے آئے تھے "غزنی و غور" سے
کہنے لگے ہے اس میں بھی اک بات نوک کی
روٹی ہم اب کماتے ہیں جوتے کے زور سے

(۲۹)

مشہور مزاح نگار شوکت تھانوی کے چچا زاد بھائی ارشد تھانوی اپنے دور کے ایک قادر الکلام شاعر اور ادیب ہیں۔ نثر ہی میں نہیں "نظم" میں بھی یہ اپنے بہت سے معاصرین میں ایک ممتاز مقام رکھتے تھے۔

اکبر نے اپنے جن معاصرین کو مخلصانہ "داد و تحسین" سے نوازا ہے ارشد بھی ان میں سے ایک ہیں۔ کہا ہے ارشد کے بارے میں۔

طرز و اسلوب ادائیں کہنو ہی ہوں یا نوی
خوب فرماتے ہیں ہر مضمون کو ارشد تھانوی

(۳۰)

۱۸۹۸ء میں اکبر کو "خاں بہادری" کا خطاب ملا۔ یہ اعزاز اس زمانہ میں بڑے عزت و افتخار کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا مگر "لسان العصر" اس "عاشقانہ داد" پر کچھ زیادہ خوش نہ ہوئے۔ کہتے ہیں۔

عاشقانہ داد یہ اچھی دی مجھ کو چرخ نے
تیغ ابرو کا تھا عاشق "خاں بہادر" کر دیا

سال بھر بعد ہی جسٹس ایکمن کے ریٹائر ہونے پر الہ آباد ہائیکورٹ کے جج مقرر کر دیئے گئے۔ فرماتے ہیں۔

جج بنا کر اچھے اچھوں کا لبھا لیتے ہیں دل
کس قدر ہیں خوشنما دو "جیم" ان کے ہاتھ میں

(۳۱)

غالب کی طرح اکبر کو بھی آموں سے عشق تھا اور آموں میں بھی لکھنؤ کے "سفیدے" اور ملیح آباد کی "دسہری" سب سے زیادہ مرغوب تھی۔ اپنے بے تکلف دوست منشی نثار حسین ایڈیٹر

(گلدستہ) پیام یار لکھنؤ کو لکھتے ہیں ۔

نامہ نہ کوئی یار کا پیغام بھیجئے
اس فصل میں جو بھیجئے بس "آم" بھیجئے
معلوم ہی ہے آپ کو بندے کا اڈریس
سیدھے الہ آباد مرے نام بھیجئے
ایسا نہ ہو کہ آپ یہ لکھیں جواب میں
تعمیل ہوگی ؟ پہلے مگر دام بھیجئے

(۳۲)

ایک مرتبہ اکبر بہت بیمار ہوگئے ۔ اللہ نے شفا دی ۔ اچھے ہوئے غسل صحت کیا ۔ اور اس سلسلہ میں احباب کی ایک دعوت بھی کی جس میں کمشنر الہ آباد مسٹر کین (MR CEAN) اور ان کی صاحبزادی مس کین (MISS CAEN) بھی شریک تھیں ۔ ایک صاحب نے مس کین کی طرف اشارہ کرتے ہوئے پوچھا۔

"یہ کون ہیں" ——

بولے ——

کین صاحب کی پیاری بیٹی ہیں[۱]

پھر کہنے لگے بھائی یہ "دعوتِ مسکین" ہے ایسے موقعوں پر "مسکینوں اور غریبوں" کو کھانا کھلانا باعثِ ثواب ہوتا ہے ۔

[۱] پورا شعر یہ ہے ۔

سامنے "کوچ" پر جو لیٹی ہیں
کین صاحب کی پیاری بیٹی ہیں

(۳۳)

جناب بہتر بھوپالی نے اکبر کے ایک خاص دوست حکیم عزیز احمد مرزاپوری سے نقل کیا کہ — جب اکبر کی دوسری بیوی (والدۂ عشرت) کا انتقال ہوا تو اکبر بہت ہی متاثر ہوئے۔ انھیں اپنی ان بیوی سے بہت ہی محبت تھی اور ان کی اولاد سے بھی — چنانچہ حکیم عزیز احمد کے تعزیت نامے کا جواب ایک شعر میں دیا جو ان کی پژمردگی اور افسردہ دلی کی منھ بولتی تصویر ہے۔

شاخ عشرت کی اب ہری نہ رہی
ہائے اکبر کی "اکبری" نہ رہی

(۳۴)

۱۹۰۵ء میں باری سے شدید تپ آئی۔ کئی دن بے حس و حرکت پڑے رہے۔ خدا نے شفا دی۔ دوبارہ زندگی پائی۔ اچھے ہوئے چند احباب صحت یابی کی مبارکباد دینے آئے تو کہنے لگے۔

علم "باری" میں یہ تپ موت کی تمہید نہ تھی
ورنہ ظاہر میں تو کچھ زیست کی امید نہ تھی

(۳۵)

"تحریک خلافت" کے زمانے میں مولانا محمد علی مرحوم نے مسلمانوں سے اپیل کرتے ہوئے کہا تھا کہ خلافت کی تحریک میں برادران وطن نے جس فراخدلی اور وسیع النظری کے ساتھ مسلمانوں کا ساتھ دیا ہے اس کا تقاضا یہ ہے کہ ہم رضا کارانہ طریقے پر گاؤکشی سے دستبردار ہو جانا چاہئے۔

اکبر خوب سمجھتے تھے کہ یہ سیاست کے کھیل ریت کے گھروندے ہیں انگریزوں نے ہندو مسلمان کے درمیان جو نفرت اور نفاق کا بیج بویا ہے وہ آسانی سے نہ سوکھ سکے گا چاہے

ہندو ٹرکی کے ساتھ ہمدردی کریں یا مسلمان "گائے" کو سچ مچ "گئو ماتا" مان لیں، کہتے ہیں۔

طب دہلی کی مدد سے بت کی صحبت بڑھ گئی
قدرتِ باری سے بتخانے کی شوکت بڑھ گئی

ڈنڈوت جب شیخ صاحب نے بھی کی پیشِ صنم
گاندھی آندھی ہو گئے چیلوں کی ہمت بڑھ گئی

آکسن جائی نے قربانی تعصب کی جو کی
"جان بل" چپ ہو گئے گایوں کی رفعت بڑھ گئی

وہ یہ کہتے تھے کہ صاحب ہی کا ہو سارا ستم
آپ فرماتے ہیں بابو کی شرارت بڑھ گئی

(۳۶)

انگریزوں نے "حقوق" کے نام پر جب بھی ہندوستان کو کچھ دیا اس کی مثال ایسی ہی تھی جیسے بھوکے کتوں کے سامنے کوئی ہڈی پھینک دی جائے۔ "منٹو ریفارم" نے بھی ہندوستان کے سامنے "الکشن" کے روپ میں ایک ایسی ہی ہڈی پھینکی تھی، کوئی چالیس پینتالیس سال ادھر! سب سے پہلے ہندوستان میں "میونسپلٹیوں" کا الکشن ہوا۔ انگریزوں کی حسب توقع ہندوستان میں یہ تخریبی اصلاحات کافی سے زیادہ کامیاب ہوئیں۔ "شر و فساد نے ایک نئے رنگ و روپ میں جنم لیا، جگہ جگہ جھگڑے فساد ہوئے، خانہ جنگیوں نے ہندو مسلمانوں کو اچھی طرح گلے لگا کر پیار کیا، بھائی سے بھائی اور باپ سے بیٹا "طلب حقوق" کے لئے جدا ہو گیا۔" "سیاسی نظریات" کے نام پر دلی کدورتیں ایک نئے انداز میں ابھر آئیں، اکبر انگریزوں کی اس بازی گری کو خاموش تماشائی بن کر کیسے دیکھ سکتے تھے۔ کہتے ہیں۔

ملک پر تاثیرِ چشمِ ووٹ طاری ہو گئی
مفت شیخ و برہمن میں فوجداری ہو گئی

(۳۷)

مولانا شوکت علی مرحوم انگریزی دشمنی میں جتنا مشہور تھے اتنے ہی سر ضیاء الدین مرحوم سرکار پرستی میں بدنام ــــ

اور جسم و جبہ کے لحاظ سے دونوں حضرات اکبر سے کہیں بڑھے چڑھے!
کہا ہے اکبر نے ــــ!

ایک شوکت اور ضیاء الدین وضع و خو میں ہیں
فرق اتنا ہے کہ وہ جنگل میں ہیں، یہ زد میں ہیں

(۳۸)

"نان کوآپریشن" کی تحریک اپنے پورے شباب پر تھی، انگریزی حکومت کے پاؤں تھرتھرا رہے تھے، بڑے بڑے انگریزی افسران پریشان تھے، یوپی کے پبلسٹی اڈیٹر "مسٹر گوج" نے جو اکبر کے پرانے دوست بھی تھے اکبر کو لکھا کہ آپ گورنمنٹ سے پنشن پاتے ہیں حکومت پر جو گاڑھا وقت پڑا ہے اس میں کچھ "کہہ کر" اپنی حکومت کی مدد کیجئے ــــ خود حضرت اکبر "نان کوآپریشن" تحریک کے حامی نہ تھے اور اگر کوئی دلچسپی ہوگی بھی تو "پنشن دار" ہونے کی وجہ سے کبھی ظاہر نہیں ہونے دی ــــ پھر بھی انھیں "مسٹر گوج" کا یہ انداز پسند نہ آیا، ان کے نقطۂ نظر سے یہ ان کی شاعری کی بہت بڑی تحقیر اور توہین تھی "مسٹر گوج" کو کوئی جواب تو نہیں دیا لیکن اپنے احباب میں اس واقعہ کا ذکر کرکے فرمایا۔

بھرتے ہیں میری آہ کو فونوگراف میں
کہتے ہیں فیس لیجئے اور آہ کیجئے

(۳۹)

مسٹر سہنا جو غالباً پہلے ہندوستانی گورنر تھے، ان کی ساری عمر برطانوی قصر شہنشاہیت کی چوکھٹ پر سجدے کرتے گذری تھی اور اسی وفاداری کے صلہ میں انھیں سر کا خطاب عطا

ہوا تھا، چنانچہ جب وہ "گورنر" ہوئے تو انھیں تہنیت اور مبارکباد کے گلدستوں سے لاد دیا گیا، اکبر نے بھی ایک پھول پیش کیا ہے ؎

خدا کے گھر سے اب آنہ کی جو خبر آئے
بتوں کے پاؤں پہ ہم کو تو سر نظر آئے

(۴۰)

۱۹۱۰ء میں علی گڑھ کی مسلم ایجوکیشنل کانفرنس مسلمانوں کی سب سے بڑی نیم سیاسی جماعت تھی لیکن مسلمانوں کا ایک طبقہ کانفرنس کے روح رواں صاحبزادہ آفتاب احمد خاں سے متفق نہ تھا اور انھیں اختلافات کی بناء پر آفتاب احمد خاں کی بڑی لے دے ہو رہی تھی، اسی زمانے میں آفتاب احمد خاں وزیر ہند کی انڈیا کاونسل کے ممبر نامزد ہو کر انگلستان چلے گئے اور مخالفت کا طوفان کچھ دھیما پڑ گیا۔

اسی زمانے میں روزنامہ ہمدم لکھنؤ میں مولوی نظام الدین حسن ہیونتوی نے "رویت ہلال" کے مسئلہ پر ایک گرما گرم بحث چھیڑ رکھی تھی "علم ہیئت" کا یہ مسئلہ علم الافلاک سے اچھل کر مذہب تک جا پہنچا تھا، علماء فرنگی محل نے مولوی نظام الدین کے مضامین کا جواب دینا شروع کر دیا تھا، ایک اچھی خاصی دلچسپی پیدا ہو گئی تھی اخباری دنیا میں

اکبر بھی اس اتار چڑھاؤ پر مسکرا رہے تھے

آفتاب احمد گئے تو چاند نماں پیدا ہوئے

(۴۱)

ہندوستان کی "آزادی کامل" کے جنم داتا مولانا حسرت موہانی ان بدنصیب لوگوں میں تھے جن کے ایثار و قربانی کی کبھی اس ملک نے قدر نہیں کی حالانکہ حسرت نے ملک و قوم کے لئے اس وقت قربانیاں پیش کیں جب گاندھی جی جنوبی افریقہ میں بیرسٹری کر رہے تھے۔ پنڈت موتی نہرو "آنند بھون" کی تعمیر میں مشغول تھے۔ جواہر لال نہرو

لندن میں تعلیم پا رہے تھے۔ آنجہانی سردار ولبھ بھائی پٹیل اجمیر میں اور چکرورتی راجگوپال اچاریہ مدراس میں وکالت کر رہے تھے۔ صدر جمہوریہ ڈاکٹر راجیندر پرشاد صوبہ بہار کے ایک گورنمنٹ کالج میں پروفیسر تھے۔ حکیم اجمل خاں انگریزوں سے خطاب "مسیح الملک" پاکر اپنی طبابت کو فروغ دینے میں مصروف تھے۔ مولانا محمد علی آئی سی ایس میں ناکامی کے بعد "بڑودہ" میں ایک اعلیٰ عہدے پر فائز تھے۔ "خادم کعبہ" مولانا شوکت علی بنارس میں اور مولوی مظہر الحق بہار میں خوش گپیوں میں وقت گزار رہے تھے۔ ڈاکٹر انصاری کا مطب فروغ پر تھا اور قائد اعظم مسٹر محمد علی جناح بمبئی میں بیرسٹری کر رہے تھے۔

اکبر کی دوررس نگاہوں میں حسرت کا پورا مستقبل تھا شاید ـــ انھوں نے غالباً اچھی طرح محسوس کر لیا تھا کہ حسرت کی زندگی کو نہ تو یہ "مشق سخن" راس آئے گی نہ "چکی کی مشقت"۔ کس خلوص کے ساتھ حسرت کو لکھا ہے۔

تھا دل حسرت بھرا ارمان میں — ہم نے لکھ بھیجا انھیں موہان میں
بھائی صاحب رکھ دو تم اپنا قلم — ہاتھ میں لو اب تجارت کا علم
ہو چکی غیروں سے خویشی کی بہار — بس دکھاؤ اب سودیشی کی بہار
کام کو اٹھو۔ چڑھاؤ آستیں
لا یضیع اللہ اجر المحسنین

(۴۲)

ہندوستان میں ریلوے ہڑتال سب سے پہلے ۱۹۱۸ء میں ہوئی اکبر نے اس "تاریخی اسٹرائک" پر یہ قطعہ لکھا۔

پسنجر کی آمد رہی درکنار — ہوا ڈاک گاڑی میں بھی انتشار
جو لی ریل والوں نے راہ فرار — ٹریفک کا ہے بند سب کاروبار
کئی دن سے سونی تھی ای۔آئی۔آر — یہ سچ کہہ گیا شاعر نامدار

بہ یک گردشِ چشمِ نیلوفری
نہ انجن بہ ماند نہ انجنیری

(۴۳)

سردار دیوان سنگھ مفتوں اڈیٹر "ریاست" نے ایک واقعہ تحریر فرمایا ہے،
دہلی سے روزانہ ریاست جاری کرنے سے پہلے راقم الحروف لکھنؤ کانپور اور الہ آباد اس غرض کے لئے گیا کہ اگر کسی پریس کا انتظام ہو جائے تو وہاں سے روزانہ اخبار جاری کیا جائے اس زمانہ میں پریس ایکٹ بہت سخت تھا کسی پریس میں بھی اخبار چھاپنے کا انتظام نہ ہوسکا میں اس سلسلہ میں جب الہ آباد گیا تو سید اکبر الہ آبادی کی خدمت میں بھی حاضر ہوا۔ میں رات کو ایک سرائے میں سوتا تھا جہاں ایک کوٹھری کرائے پر لے رکھی تھی مگر دن بھر اکبر صاحب کے پاس عشرت منزل میں، وہاں چار پانچ روز رہا۔
حضرت اکبر جیسے شاعروں اور فلاسفروں کو دنیا صدیوں کے بعد پیدا کرتی ہے۔ اکبر تمثیل دینے کے اعتبار سے بھی اپنا ثانی نہ رکھتے تھے۔ ایک روز فیاضی اور کنجوسی کے فلسفے پر باتیں ہو رہی تھیں، آپ نے فرمایا۔
روپیہ سے اتنی محبت کرنی چاہیئے جتنی ایک انگریز اپنے "بیرا" یا خانساماں سے کرتا ہے، یعنی جب "بیرے" یا خانساماں سے کام لینا ہو تو انگریز بیرے اور خانساماں کو اپنے کمرے میں اپنے پاس بلا لیتا ہے، مگر جب کام نکل جائے تو اس بیرے یا خانساماں کو صاحب کے کمرے میں ایک منٹ بھی ٹھہرنے کی اجازت نہیں ہوتی۔ ایسے ہی روپیہ سے کام لو، مگر اس سے محبت نہ کرو۔

(۴۴)

یو پی کے ایک معزز خاندان کی ایک معمولی ملازمہ نے اپنی اکلوتی لڑکی کو انگریزی اسکول میں داخل کرایا، شاید اس نے سوچا کہ جب یہ کافی پڑھ لکھ جائے گی تو کسی پڑھے لکھے معزز

اور شریف آدمی سے اس کی شادی ہو سکے گی مگر بے چاری کی یہ حسرت پوری نہ ہو سکی اور صاحبزادی کچھ پڑھ لکھ کر بھی کسی کی نگاہوں میں نہ سما سکیں، یہانتک کہ حالات نے انھیں اپنے خاندانی پیشے "ماماگیری" پر مجبور کر دیا، اکبر کو جب اس لڑکی کا انجام معلوم ہوا تو فی البدیہہ یہ شعر کہا۔

رہیں ہر پھر کے آیا جی نفیسن[1]
وہ گو اسکول میں برسوں پڑھا کیں

[1] یہ نام فرضی ہے لڑکی کا اصلی نام نہیں ہے۔

(۴۵)

انگریزوں نے ہندوستان کا دارالسلطنت جب کلکتے سے "دہلی" منتقل کیا تو ۱۹۱۱ء میں لاکھوں روپیہ صرف کر کے دہلی میں "دلی دربار" منعقد کیا، ایک بڑا ہی شاندار اور تاریخی جشن جو انگریزوں کی سیاسی تاریخ میں یادگار رہے گا، دلی دربار میں شرکت کے لئے "جارج پنجم" لندن سے تشریف لائے ہندوستان کے تمام والیان ملک، راجہ، مہاراجہ امرار اور دوسار سب نے انگریزوں کی اس "سیاسی عیاشی" میں ہاتھ بٹایا اکبر بھی یہ تماشا دیکھنے کے لئے دہلی گئے ـــ دلی دربار دیکھا اور اچھی طرح دیکھا، آتش بازی بھی چھٹتے دیکھی، اور مفت کی دولت "لٹنے" کا منظر بھی اپنی آنکھوں سے دیکھا، دلی دربار پر پوری نظم کہی اور بہت خوب کہی، لیکن ایک سفر میں "آنجہانی جارج پنجم" کی اس چند روزہ تشریف آوری کو "خدمت قوم" کہنے سے بھی نہیں چوکے، کہتے ہیں۔

لندن سے دہلی آئے ہیں دس یوم کے لئے
یہ زحمتیں اٹھائیں فقط قوم کے لئے

(۴۶)

یوپی کے ایک بڑے انگریز افسر جو اپنی کامیابی اور ہر دل عزیزی کے لئے تمام عمر آدھے ہندوستانی بنے رہے، وہی ہندوستانی لباس وہی بول چال، وہی رنگ

ڈھنگ، یو پی کے تمام بڑے لوگوں سے میل جول تھا اور عام خیال یہی تھا کہ اب پنشن لینے کے بعد یہ کہاں جائیں گے ہندوستان چھوڑ کر پورے نہیں تو آدھے ہندوستانی ہو ہی چکے ہیں، حضرت اکبر سے بھی ان کے اچھے خاصے دوستانہ مراسم تھے، جب ان صاحب بہادر کی پنشن ہوئی اور ان کی الوداعی پارٹی ہوئی تو حضرت اکبر بھی شریک ہوئے صاحب بہادر کے ہندوستانی دوستوں نے پوچھا کہیے اب کہاں رہنے کا ارادہ ہے پنشن کے بعد صاحب بہادر نے مسکراتے ہوئے بتایا کہ جلد ہی انھیں اپنے وطن مالوف یورپ واپس جانا ہے۔ سامان کا نیلام ہو رہا ہے اور وہ پا در رکاب ہیں، حضرت اکبر کو ان کی "ہندوستانی دوستی" سے ایسی امید نہ تھی، کافی اثر ہوا، الوداعی پارٹی سے واپس آئے تو دوستوں سے سارا واقعہ بیان کیا اور یہ شعر پڑھا۔

فرنگی سے کہا پنشن ہوئی تو اب یہیں رہیے
کہا۔ ع جینے کو آئے تھے یہاں مرنے نہیں آئے

(۴۷)

ذکر کسی "ہتک عزت" کے مقدمہ کا تھا، جس میں ایک شخص نے دوسرے کو برا بھلا کہا تھا، اس نے "ازالہ حیثیت عرفی" کا دعویٰ دائر کر دیا تھا، بات بڑے آدمیوں کی تھی، دوستوں نے مل جل کر معاملہ ختم کرا دیا، جنھوں نے برا بھلا کہا تھا کھلی عدالت میں تحریری معافی نامہ داخل کر کے اپنے الفاظ واپس لے لیے تھے۔

اکبر کے سامنے جب یہ واقعہ بیان کیا گیا، بہت ہنسے، کہنے لگے "اس انگریزی تہذیب نے ہندوستان کو یہ "الفاظ واپس لینے" کی ترکیب بھی اچھی بتا دی ہے کچھ ٹھہر کر کہنے لگے۔

جب الفاظ واپس لیے جا سکتے ہیں تو تھپڑ اور "جوتا" بھی واپس لیا جا سکتا ہے۔

کچھ دیر سوچ کر لکھتے رہے اور یہ قطعہ سنایا۔

کی تھی "پاپوش زنی" جب ہوئی نالش دائر   کہدیا صلح کرو، لیتا ہوں جوتا واپس

واپسی گو تھی زبانی ہوئی نالش ڈسمس
ہو گیا کورٹ سے وہ شوخ اچھوتا واپس

(۴۸)

دلی سے سات آٹھ میل فاصلے پر جمنا ندی کے کنارے ایک گاؤں "اوکھلا" ہے جہاں ہندوستان کی ایک مشہور تعلیم گاہ "جامعہ ملیہ" بنائی گئی ہے ۔ سیر و تفریح کے لئے ساری دلی میں اس سے خوبصورت اور اچھی کوئی دوسری جگہ نہیں ہے یہیں پر یوپی اور دلی کی سرحد ملتی ہے اور حکومت یوپی نے بند بنا کر یوپی کے لئے یہاں سے ایک نہر بھی نکالی ہے۔ اکبر مرحوم جب ایک بار دلی تشریف لے گئے تو یہ نہر بھی دیکھنے گئے "اوکھلا" میں کچھ احباب نے ان کے اعزاز میں انھیں دعوت دی ۔

جب اکبر مرحوم جمنا کا بند دیکھنے گئے تو بہت سے احباب ساتھ تھے ایک صاحب نے بتایا کہ "بند" باندھ کر یہ نہر نکالنا ایک انگریز مسٹر "کاٹلی" کی کوششوں کا نتیجہ ہے "کاٹلی" کا نام سن کر اکبر کی ظرافت کا بند ٹوٹ گیا برجستہ فرمایا۔

"کاٹلی صاحب نے جمنا کاٹ لی"

(۴۹)

ہندوستان میں پہلے پہل "نوٹ" جاری ہوئے تھے اس سے پہلے چاندی سونے اور تانبے کے سکے رائج تھے ۔ ہر نئی تبدیلی عوام میں ہیجان اور خلفشار پیدا کر دیتی ہے پھر ہندوستان میں تو انگریزوں کے خلاف ایک اچھا خاصا جذبہ نفرت موجود تھا ۔ نوٹوں کے اجراء پر طرح طرح کی چہ میگوئیاں شروع ہو گئیں ۔ اکبر کا نظریہ خواہ کچھ ہو لیکن وہ اس "شور و شر" کو فضول سمجھتے تھے

حرج کیا روپیہ جو کاغذ کا چلا
شکر کر روٹی تو گیہوں کی رہی

(۵۰)

"منٹو مارلے ریفارم" کے سلسلہ میں جو "کمیشن" مقرر کیا گیا تھا وہی ہندوستان

کے تعلیمی مسائل کا بھی تجزیہ کر رہا تھا اس "کمیشن" نے بھی ہندوستان کے مختلف مقامات کا دورہ کر کے بہت سے "اہل الرائے" افراد کے بیانات لکھے تھے ـــــ اس کمیشن پر چوٹ کرتے ہوئے اکبر نے کہا ہے ـ

چرخ نے پیش "کمیشن" کہدیا اظہار میں
قوم کالج میں اور اس کی زندگی اخبار میں

(۵۱)

لارڈ کرزن کا شمار ان ہندوستان دشمن انگریزوں میں کیا جاتا ہے جنھوں نے ہمارے ملک کو سب سے زیادہ نقصان پہونچایا ـــ انھیں ہندوستان اور ہندوستانیوں سے ایک قسم کا بغض للّٰہی تھا کسی موقع پر انھوں نے ہندوستان اور ہندوستانیوں کے خلاف زہر افشانی سے گریز نہیں کیا ـــ ایک پبلک جلسے میں تو کرزن نے ہندوستانیوں پر نہایت ہی رکیک اور شرمناک حملے کئے ـــ اور یہاں تک کہدیا کہ "ہندوستانی حد درجہ بے ایمان اور جھوٹا ہوتا ہے"۔

کرزن کے اس "ریمارک" پر ہندوستان بھر میں سخت احتجاج کیا گیا اکبر بھی ایک محب وطن ہندوستانی تھے اس قومی بحث پر کیسے خاموش ہو جاتے ـ کہا ہے ـ

جھوٹ سچ کی چھڑی بحث ہندیہ | سچ کہتے ہیں جو جھوٹے ہو ـ کہتے تھے روسیاہ بیڈھب ہے ـ
آپ تو ہیں ہم پہ حکمراں | جھوٹے ہیں ہم ـ تو آپ ہیں "جھوٹوں کے بادشاہ"
کیسے ہی ہم ہوں ـ

(تنقید گورکھپور ۲۵ رجولائی ۱۹۱۶ء)

(۵۲)

۱۹۰۵ء میں جب لارڈ کرزن وائسرائے تھے اسی زمانے میں "کچنر" کمانڈر انچیف کے عہدے پر فائز تھے ـ دونوں کی "پالیسی" میں بعد المشرقین تھا ـ یہ مشرق کی طرف جا رہے تھے تو وہ مغرب کی طرف ـــ اختلافات کی چنگاریاں سلگتے سلگتے ایک دن شعلہ بن گئیں کرزن کو شکست ہوئی اور وہ استعفے دیکر انگلستان واپس چلے گئے ـ کرزن کی ہندوستان

دشمنی ضرب المثل تھی لیکن اکبر سرکاری "پنشن خوار" ہونے کے باوجود تھے تو ہندوستانی ہی۔ کہتے ہیں۔

"کرزن و کیچنر" کی حالت پر جو کل
وہ صنم تشریح کا طالب ہوا
کہدیا میں نے کہ ہے یہ صاف بات
دیکھ لو تم "زن" پہ "نر" غالب ہوا

(۵۴)

ججی کے زمانے میں کچھ "روشن خیال" اور حکام رس افراد نے انگریز افسروں کو سمجھایا کہ ـــ اکبر اپنا زیادہ وقت شعر و شاعری میں برباد کیا کرتے ہیں "کام دام" کچھ نہیں کرتے ـــ اس کے علاوہ اپنے اشعار میں وہ مغربی تہذیب و تمدن پر چوٹیں بھی کر جاتے ہیں ـــ

انقلاب ۵۷ء کے بعد انگریز یا سنداوں کے تصوّر میں اس "نو آبادی" کا جو نقشہ تھا اس میں ملک گیری کے علاوہ مسیحیت اور مغربیت کے پرچار کا پروگرام بھی شامل تھا باضابطہ طور پر تو اس قسم کا کوئی حکم دیا نہیں جا سکتا تھا۔ بے ضابطہ اور غیر رسمی طور پر اکبر سے کہا گیا کہ وہ شاعری چھوڑ دیں۔ چنانچہ کہتے ہیں۔

حکم اکبر کو ہوا ہے کہ کر "ترک سخن"
خواجہ حافظ بھی نکالے گئے میخانے سے

لیکن ـــ ان "گیدڑ بھبکیوں" میں کیا اثر ہوتا اکبر پر ـــ انھوں نے صاف صاف کہہ دیا۔

گذر چکا ہے مرا کام ضبط سے اکبر
میں رازِ عشق اب اپنا چھپا نہیں سکتا

اسی واقعہ کو ایک دوسرے قطعہ میں بھی نظم کیا ہے۔

ہے منع ملاقات مری ہم نفسوں سے
فریاد کا موقع نہیں فریاد رسوں سے
تعداد وہی انگلیوں کی گو ہے بدستور
بیگانگیٔ ساعد و بازو ہے دسوں سے
ہے حکم کہ جس پالسیوں کے ہو مطابق
اب کام بدن کو نہ رگوں سے نہ نسوں سے
چوری نہ کبھی کی ہے نہ کرنے کا ارادہ
پھر بھی یہ ضرورت ہے کہ بھاگوں عسسوں سے

(۵۴)

دسمبر ۱۹۱۶ء میں علی گڈھ اور لکھنؤ میں کئی سیاسی تعلیمی اور مجلسی کانفرنسیں منعقد ہوئیں خواجہ حسن نظامی صاحب پر مچھلی بازار کانپور کے ایجی ٹیشن کی وجہ سے یوپی میں آنے پر پابندیاں عائد تھیں اکبر خواجہ صاحب کے خاص دوست تھے اسی لئے حکومت کی نگاہیں ان پر بھی تھیں، اردو کانفرنس لکھنؤ میں شرکت کی اجازت خواجہ صاحب کو مل گئی تو خواجہ صاحب نے اکبر کو بہت لکھا کہ آپ بھی کانفرنس میں شرکت کے لئے لکھنؤ آجائیے۔ دوسرے دوستوں نے بھی اصرار کیا مگر اکبر اپنی جگہ سے نہ ہلے۔ خواجہ صاحب کو لکھا۔

نہیں ہے جنبش کی ان میں قوت جو گفتگو کو کھڑے ہوئے ہیں
بندھے ہوئے ان کے ہاتھ دیکھے ہیں پاؤں انکے گڑے ہوئے ہیں
معاف رکھیں ہمیں خدارا انھیں کو ہو لیڈری مبارک
ہم ایک گوشے میں اپنے اچھے دبے دبائے پڑے ہوئے ہیں!

(۵۵)

قدیم "رموز آداب" میں "قبلہ و کعبہ" کو خاص اہمیت حاصل تھی، خواجہ حسن نظامی صاحب پہلے شخص ہیں جنھوں نے ایسے متردکات کی طرف پہلا قدم اٹھایا، اپنے اخبار یا رسالہ میں اس کے متعلق مضمون لکھا۔ اس پر ایک "پیر کہن سالہ" نے اخبار مشرق میں ایک جوابی مضمون لکھ مارا اور خواجہ صاحب کی ذات پر بھی کیچڑ اچھالنے کی کوشش کی، اکبر نے یہ جوابی مضمون پڑھ کر خواجہ صاحب کو لکھا۔

"جی چاہتا ہے جواب لکھوں ——! میں نے تو ایک دفعہ لکھا تھا "جناب جامع مسجد دہلی مدظلہ" —— یہ کیا؟

جناب من بات یہ ہے کہ ہر شخص سے بلحاظ مرتبہ خطاب مناسب ہے بالفعل "جامع مسجد دہلی" آیندہ ترقی کیجئے گا تو "کعبہ" بھی لکھوں گا ——"

(۵۶)

۲ر جون ۱۹۱۶ء کو خواجہ حسن نظامی صاحب کو لکھا۔

"امید ہے کہ آپ خیریت سے پہونچ گئے ہوں گے۔

"پا بر رکاب ہوں"، کیسا پیارا محاورہ ہے، ابھی گھوڑے پر سوار ہوں گے، باگ اپنے ہاتھ میں ہوگی، لیکن اب تو شاید "ٹکٹ بدست" ہونا زیادہ صحیح ہوگا۔

محاورات کو بدلیں براہ ریل جناب
ٹکٹ بدست کہیں اب بجائے پا بہ رکاب

(۵۷)

۱۹ء میں اکبر دہلی گئے، چلتے وقت خواجہ حسن نظامی نے ایک تعلیم یافتہ نوجوان کو ساتھ کر دیا کہ ان سے کچھ تحریری کام لے لیا کیجیے، وہ نوجوان اکبر کے ساتھ الہ آباد آکر رہنے سہنے لگے۔ اکبر نے انھیں ہدایت کی کہ میاں اگر کوئی خاص بات میرے منھ

سے نکلے تو اسے نوٹ کر لینا یہ ہدایت پا کر وہ صاحب ہر وقت اکبر کا منھ تکنے لگے جہاں اکبر کے لب ہلے انھوں نے قلم سنبھالا۔

ایک دن صبح کے وقت اکبر کی زبان سے "کل من علیھا فان" نکل گیا، لاالہ باعتبا عینک، قسم کے نوجوان نے جلدی سے نوٹ بک پر ٹانک لیا جب پوچھا اکبر نے ـــ کیا لکھا!

نوٹ بک نکال کر پڑھنے لگے۔

آج آٹھ بجکر دس منٹ پر حضرت اکبر نے فرمایا، "کل من علیھا فان" اکبر کہنے لگے اللہ تم پر رحم کرے، اسے کاٹ دو یہ میرا" فرمایا ہوا نہیں ہے تھوڑی دیر میں اسی مضمون کو شعر کے قالب میں ڈھال دیا۔

سب کو فنا، خدا کو بقا، بات حق یہ ہے
میں کیا کہوں گا یہ خدا کی کہی ہوئی

(۵۸)

اکبر دلی میں ہمیشہ خواجہ حسن نظامی کے یہاں ٹھہرا کرتے تھے "نظام الدین اولیا" میں خواجہ حسن نظامی سے دوستانہ مراسم اور خواجہ نظام الدین اولیا رحمتہ اللہ علیہ سے عقیدت تھی! بستی نظام الدین اولیا، کے ایک ویران گوشے میں مرزا غالب کا مزار بنا ہوا ہے، ایک چھوٹی سی ٹوٹی پھوٹی چہار دیواری میں بے چھت اور مقبرہ کے منہدم سی قبر (شاید اب درست ہو گئی ہے) ایک دن خواجہ حسن نظامی نے کہا۔

"آیئے غالب کے مزار پر فاتحہ پڑھ آئیں چل کر۔!

اکبر نے تجاہل عارفانہ سے پوچھا۔

"کون غالب"

ارے آپ غالب کو نہیں جانتے! خواجہ نے تعجب ظاہر کیا کہنے لگے اکبر ـــ!

"اچھا وہی غالبؔ جنھوں نے یہ شعر کہا ہے":

ہم کو معلوم ہے جنت کی حقیقت لیکن
دل کے بہلانے کو غالبؔ یہ خیال اچھا ہے

جسے "جنت" کے وجود ہی سے انکار ہے اسے فاتحہ سے کیا ثواب پہنچے گا!

۵۹

یورپ میں پہلی جنگِ عظیم کے شعلے بھڑک رہے تھے اور ہندستان میں ڈاکٹر اقبال اور خواجہ حسن نظامی حافظ شیرازی کے رموزِ تصوف پر دست و گریباں تھے خواجہ حسن نظامی "حافظ" کے نکاتِ تصوف کو دوسرے نقطۂ نظر سے دیکھتے تھے ڈاکٹر اقبال اور طرح پر! اکبر بظاہر "خواجہ پارٹی" کے آدمی سمجھے جاتے تھے، ڈاکٹر اقبال کو بھی یہی بدگمانی تھی حالانکہ اکبر کے بعض نظریات خواجہ صاحب سے الگ تھے، اقبال اور خواجہ کی لڑائی میں بھی وہ غیر جانبدار رہے تھے ڈاکٹر اقبال کے فارسی شعر پر دو مصرعہ لگا دیئے۔

حضرتِ اقبال اور خواجہ حسن
پہلوانی ان میں، اُن میں بانکپن

جب نہیں ہے زورِ شاہی کیلئے
آؤ گتھ جائیں خدا ہی کیلئے

ورزشوں میں کچھ تکلف ہی سہی
ہاتھا پائی کو تصوف ہی سہی

ہست در ہر گوشۂ ویرانہ رقص
می کند دیوانہ با دیوانہ رقص

۶۰

ڈاکٹر اقبال اور خواجہ حسن نظامی کی "جنگ تصوف" جاری ہے دونوں طرف سے پُر جوش گولہ باری ہو رہی ہے، ڈاکٹر اقبال کہتے ہیں، کہ حافظ شیرازنے "کنار رکن آباد"

میں جو "مئے معرفت" لنڈھائی ہے وہ دراصل مہوے کی شراب تھی۔ خواجہ اس پر مُصر ہیں کہ یہ "بادہ عرفاں" دنیوی ٹھرہ نہیں ہے، اکبر یہ جنگ دیکھ دیکھ کر کڑھ رہے ہیں، دل خواجہ کے ساتھ ہے، مگر ڈاکٹر اقبال سے بھی بگاڑنا نہیں چاہتے، پھر بھی جی یہی چاہتا تھا کہ یہ بات اس طرح پر نہ بڑھتی، فرماتے ہیں۔

مولوی ہو ہی چکے تھے نذر کالج اس سے قبل
خانقاہیں رہ گئی تھیں اب ہے ان کا انہدام
لکچرر مضمون لکھتے ہیں تصوّف کے خلاف
الوداع اے ذوقِ باطن الوداع اے فیض عام

یکایک "بادہ عرفاں" اور مہوے کی شراب کا خیال آتے ہی ایک دوسری انگڑائی لیتے ہیں۔

بنا ڈالتے ہیں وہ حکمت کے باغ کی
ہنسی سے ہو رہی ہے صفائی دماغ کی

(۶۱)

ڈاکٹر اقبال اور خواجہ حسن نظامی کی "جنگ تصوّف" کوئی ذاتی لڑائی تو تھی نہیں عالمانہ مجادلہ تھا، دونوں کے دل ایک دوسرے سے قریب ہوتے گئے یہاں تک کہ ڈاکٹر اقبال نے خواجہ حسن نظامی کو لکھا کہ میں آپ سے ملنا چاہتا ہوں۔

خواجہ صاحب نے اکبر کو اس ملاقات کے بارے میں لکھا۔ اکبر تو اس "ساعت مسعود" کے منتظر ہی تھے خواجہ کو لکھا۔

اے خواجہ حسن کرو نہ اقبال کو رد — تو بھی رکنوں کے ہیں نگہباں وہ بھی
تم محو ہو حسن کی تجلی میں اگر — ہیں دشمن فتنۂ رقیباں وہ بھی
پریوں کے لئے جنون ہو تم کو اگر — دیوؤں کے لئے ہیں سلیماں وہ بھی

(۶۲)

تحریک خلافت اور ترک موالات کے زمانہ میں بطور احتجاج سیکڑوں ہندو مسلمان نے سرکاری ملازمتوں سے استعفے دے دیئے اسی کے ساتھ خطابات کی واپسی کا زور شروع ہو گیا" اکبر" کو کسی سیاسی خیر خواہی یا وطن سے غداری کے سلسلے میں خان بہادری کا خطاب نہیں ملا تھا بلکہ یہ خطاب ان کی خدمات ججی کا اعتراف تھا ایک طرح سے اسی لئے وہ کسی قیمت پر خطاب واپس کرنے کے لئے تیار نہ تھے ایک تو وہ ان سیاسی تحریکات کے حامی ہی نہ تھے دوسرے ججی کی پنشن بھی ملتی تھی! خواجہ حسن نظامی کو لکھا۔

"واپسی خطاب پر ابھی کچھ نہیں کہہ سکتا لوگوں کو چاہیئے کہ نماز واپس لیں، ڈاڑھی واپس لیں، عورتیں پردہ واپس لیں"۔

لکھنؤ کا "ہمدم" واپسی خطابات کی تحریک پر زور دے رہا تھا، ہمدم کے ایڈیٹر سید جالب مرحوم دہلوی اکبر کے دوست تھے چنانچہ حکیم مومن دہلوی کے ایک شعر پر تضمین کر کے سید صاحب کو بھیجدی۔

کوچۂ سروس انگلش میں رہے ہم ساکن جاہ و زر ہی کی تمنا میں کٹے زیست کے دن
وعظ گاندھی سے بدل سکتے ہیں کیونکر باطن عمر ساری تو کٹی عشق بتاں میں مومن
آخری وقت میں اب خاک مسلماں ہوں گے

جاہ و زر کے رہے انگلش سے ہمیشہ طالب عہد پیری میں بدل سکتے ہیں کیونکر قالب
مشتہر کر دیں یہ ہمدم میں جناب جالب عمر ساری تو کٹی عشق بتاں میں مومن
آخری وقت میں اب خاک مسلماں ہوں گے

(۶۳)

اکبر لکھنؤ پہونچے ——— خواجہ حسن نظامی صاحب کو اپنے بخیریت پہونچنے کی اطلاع دیتے ہیں، لکھا ہے۔

میں آج دوپہر کو یہاں پہونچا۔

اپنی آباد میں کھولی کمر لیکن زباں چپ ہے
سفر کا بار دوش اترا ہے بار دل نہیں اترا

(۶۴)

شمس العلماء خواجہ حسن نظامی ایک واقعہ تحریر فرماتے ہیں ایک دن ہم سب کھانا کھا رہے تھے آلو کا سالن تھا، حضرت اکبر بھی شریک طعام تھے حور بانو (خواجہ صاحب کی صاحبزادی) سے پوچھا! کبھی یہ آلو کہاں سے آئے، بڑے اچھے ہیں؟ حور بانو نے جواب دیا — میرے خالو بازار سے لائے ہیں' چند منٹ سکوت فرماکر حضرت اکبر مسکرانے لگے اور فی البدیہہ یہ شعر پڑھا۔

لائے ہیں ڈھونڈھ کے بازار سے آلو اچھے
اس میں کچھ شک نہیں ہیں "حور" کے خالو اچھے

اور اس برجستہ شعر پر سب لوگ بے ساختہ ہنسنے لگے!

(۶۵)

ایک دفعہ اکبر دلی میں خواجہ حسن نظامی کے مہمان تھے حسب رواج خانقاہی دو طوائفیں سلام کرنے کے لئے حاضر ہوئیں حسن نظامی نے انھیں ٹال دیا — مگر اکبر کب چوکنے والے تھے کہنے لگے۔

میں تو سمجھتا تھا کہ اس گھر میں فرشتے ہی نازل ہوتے ہیں۔ اب معلوم ہوا کہ "حوریں" بھی اترتی ہیں۔

فقیروں کے گھروں میں لطف کی راتیں بھی آتی ہیں
زیارت کے لئے اکثر "مسماتیں" بھی آتی ہیں

(۶۶)

ہندوستان کے ایک مشہور لیڈر نے ایک پارسی لڑکی کو اپنی بیوی بنالیا تو اس پر کافی شورش پھیلی ــــ اور اسلامی نقطۂ نظر سے ان تعلقات "زن وشو" پر کافی لے دے ہونے لگی اور مطالبہ کیا گیا کہ پہلے اس پارسی لڑکی کو مسلمان کرلیا جائے تب وہ . . . . کی بیوی بن سکتی ہے ایک دوسرے طبقے کا خیال تھا کہ پارسی چونکہ اہل کتاب ہیں اس لئے ان سے عقدِ مناکحت جائز ہے ۔ اکبر حیرت سے اس بحث کو سُن رہے تھے کیوں کہ ان کے نزدیک صورت حال یہ تھی ؎

پہلے ہوتی ہے حسرتِ زن پیدا
بعد اس کے ہے بحثِ "نیشن" پیدا

(۶۷)

بحث یہ تھی کہ دیس اور دیسیوں کے متعلق بدیسیوں سے ساز باز کرنا ملک اور قوم کے ساتھ غداری ہے، اکبر کو "ترک موالات" "تحریک خلافت" یا "ہوم رول" سے بہمہ وجوہ اتفاق نہیں تھا پھر بھی دل میں اپنے ملک وملّت کا اتنا ہی درد تھا جتنا ایک ہندوستانی مسلمان کے دل میں ہونا چاہیئے ــــ کہنے لگے، اس مسئلہ میں دورائیں ہو ہی نہیں سکتیں میں نے کہا ہے ایک قطعہ

اونٹ نے گایوں کی ضد پر شیر کو ساجھی کیا
پھر تو مینڈھے سے بھی بدتر سب نے پایا اونٹ کو

جس پہ رکھنا چاہتے ہو باقی ابھی دسترس
منھ میں ہاتھی کے کبھی اے بھائی وہ گنّا نہ دو

(۶۸)

دہلی کے ایک مشہور حکومت پرست اور مغرب زدہ خان بہادر مولوی عبدالاحد صاحب کا انتقال ہوا۔ ان کی ساری زندگی حکومت کی چاپلوسی اور انگریزی طرزِ معاشرت

کی نقالی میں گذری تھی دلی والوں سے انھوں نے کبھی کوئی سروکار نہیں رکھا، اسی لئے دلی کے مسلمانوں نے کہا کہ وہ مسلمان نہیں تھے اور نہ ہم انھیں مسلمانوں کے قبرستان میں دفن ہونے دیں گے خاں بہادر صاحب کے اس عبرتناک انجام پر اکبر مرحوم کے دل سے بھی ایک آواز شعر بنکر نکل گئی

تھے معزز شخص، لیکن ان کی لائف کیا لکھوں
گفتنی درج گزٹ، باقی جو ہے نا گفتنی

۵ خاں بہادر کے انتقال پر دلّی کے مشہور اخبار "کرزن گزٹ" نے ان کے حالات شائع کئے تھے۔

(۶۹)

اکبر اچھی طرح سمجھ چکے تھے کہ آج کی دنیا میں مسلمان شیعہ یا سنی بن کر زندہ نہیں رہ سکتا، مسلمان صرف مسلمان ہی بن کر باقی رہ سکتا ہے چنانچہ خواجہ حسن نظامی صاحب کو لکھا ہے۔ اس وقت شیعہ سنی کے الفاظ بالکل بے معنی ہیں، عملی پہلو کے لحاظ سے صرف ڈھانچے کا رکھ رکھاؤ سوشل مجبوری سے ہو رہا ہے اگر مجھ سے آپ سے ملاقات مقدر ہے تو میرے خیالات اس باب میں سنیئے گا، میرے دادا شیعہ تھے، پردادا کی خبر نہیں غالباً سنی سپاہی تھے، اب تو میں یہ کہتا ہوں کہ ۵

شیعہ کو مجھ سے کچھ بھی خوف و خطر نہیں ہے
وہ ہو علیؓ تو باشد، بندہ عمرؓ نہیں ہے

(۷۰)

ایک وکیل صاحب جن سے اکبر سے بھی اچھے خاصے مراسم تھے اپنے سنی دوستوں میں بیٹھ کر اپنی بے تعصبی کے ڈھول پیٹنے کے لئے اکثر کہا کرتے، میں شیعہ گھرانے میں پیدا ہوا ہوں مگر پھر بھی شیعہ نہیں ہوں، ماتم، مجلس، تعزیے اور علم وغیرہ کو فضول اور بے کار سمجھتا ہوں ـــ اکبر مرحوم کو ان کی اس "دو رنگی" سے سخت نفرت تھی، کیونکہ اپنے شیعہ ہونے سے خود انکار تھا مگر وہ اپنے سنی

ہونے کا اقرار بھی نہیں کرتے تھے پھر بھی اپنے آپ کو مسلمان سمجھتے تھے، عجب تماشا تھا! اکبر ان کی اس دورنگی پر کہا کرتے تھے کہ یہ "مونث" اور "مذکر" کے بیچ کی "درمیانی جنس" ہیں اور یہ شعر انھیں کے متعلق کہا ہے۔

مذکر کے لئے "ہی[1]" ہے مونث کے لئے "دشی[2]" ہے
مگر حضرت مخنث ہیں نہ ہیئوں میں نہ شیوؤں میں

SHE ۔۲ HE ۔۱

(۷۱)

ایک دن کہنے لگے ــــ

رسول اللہ نے تو ہم سب کو مسلمان بنایا تھا لیکن اہل یورپ نے "محمڈن" مشہور کردیا، دراصل یہ ایک طنز اور طعنہ ہے لیکن ہمیں محسوس نہیں ہوتا۔

اس کے بعد پوٹ بک نکال کر یہ شعر سنائے۔

کمیٹی کل ہوئی برگیڈ میں، میں چپ رہا بیٹھا
طلب میں اپنے حصہ کی ہر اک ممبر نے منہ کھولا
کمیٹی جب ہوئی برخاست اور حصہ ملا سب کو
چھ ماشہ سونا ہر اک کو ملا اور مجھ کو اک تولا
کہا صاحب نے یہ انعام دوہرا تم کو ملتا ہے
سبب یہ ہے کہ تم چپکا رہا اور کچھ نہیں بولا

(۷۲)

ایبٹ آباد (پنجاب)، کے ایک وکیل "الف دین" صاحب نے اپنی تصنیف کی ہوئی حقانیت اسلام پر ایک کتاب تبصرہ کے لئے اکبر کو بھیجی ــــ وکیل صاحب کے نام "الف دین" کی ترتیب پر اکبر پھڑک ہی تو اٹھے، کہنے لگے۔

گل زگلزار اقا... بھئی پنجاب میں عجیب قسم کے نام رکھے جاتے ہیں، چراغ دین علم دین... گل زگلزار اقا

سرک از کوئے محمد (ص)۔

دیر تک ہنستے رہے پھر وکیل صاحب کو یہ شعر لکھ کر بھیجدیا۔

"الف دین" نے خوب لکھی کتاب
کہ بیدین نے پائی راہ صواب

(۷۳)

ہندوستان کے مسلمانوں کو سب سے زیادہ "تبلیغ" اور مناظرے نے تباہ کیا، سوامی دیانند سرسوتی نے جب "آریہ سماج" کی داغ بیل ڈالی تو جگہ جگہ آریوں اور مسلمانوں" کے مناظرے ہونے لگے آئے دن بڑے بڑے جلسے ہوئے، گھنٹوں تقریریں ہوتیں مزاجوں میں گرمی پیدا ہوتی، سنجیدگی اشتعال میں بدل جاتی نہ کوئی آریہ ان مناظروں سے متاثر ہوکر مسلمان ہوتا اور نہ کوئی مسلمان آریہ ــ مگر مذہب کے نام پہ یہ خانہ جنگی برابر جاری رہی اور عرصہ تک! نواب احمد حسین خاں مرحوم مذاق (تعلقدار پریانواں ضلع پرتاپ گڑھ) عشرت حسین کے خسر اور اکبر مرحوم کے سمدھی تھے، بہت پڑھے لکھے راسخ العقیدہ مسلمان، تعصبات اور تنگ نظری کے دشمن۔ اکبر سے اکثر اسی "مذہبی بدحالی" پر تبادلہ خیال کیا کرتے تھے، اکبر نے اس قطعہ میں اسی طرف اشارہ کیا ہے۔

دیکھا مناظروں کا بہت اس نے رنگ ڈھنگ
اکبر کے دل میں اب نہ رہی بحث کی امنگ
کہتے بہت صحیح تھے یہ حضرت مذاق
ایماں برائے طاعت و مذہب برائے جنگ

(۷۴)

اکبر کے ایک دوست مولانا محمد کافی صاحب نے ایک دن برسبیل تذکرہ بیان کیا ــ

کہ ایک مغرب زدہ بیرسٹر صاحب ایک روز ان سے الجھ پڑے اور کہنے لگے۔
"معاف فرمایئے گا، ہمارے اور آپ کے خیالات کا کہیں بھی میل نہیں ہو سکتا۔
مولانا نے جواب دیا۔
نہیں ہمارا آپ کا مرکز اتصال خیال ایک مقام ہے۔
بیرسٹر صاحب نے پوچھا۔
وہ کہاں —؟
مولانا بولے —
قبرستان —!
اکبر کہتے ہیں کہ یہ شعر مولانا کے اسی جوابِ نے مجھ سے کہلوایا ہے

اسٹیشن فنا کی بھی کیا خوب ریل ہے
اس راہ میں ہر ایک پسنجر کا میل ہے

(۷۵)

ایک دن ایک گریجویٹ اکبر سے ملنے کے لئے تشریف لائے ان کی تاریخی قابلیت اور سلجھی گفتگو سے اکبر بہت متاثر ہوئے دن ڈھل چکا تھا۔ مغرب کی اذان ہوئی، اذان سنتے ہی وہ صاحب بولے —
اچھا تو — اب میں اجازت چاہتا ہوں۔
سب لوگ مسجد کی طرف بڑھے اور وہ دروازے کی طرف!
اکبر حیرت میں تھے کہ الٰہی کیا پڑھ لکھ کر مسلمان روزے نماز سے بے نیاز ہو جاتا ہے کہنے لگے مسلمانوں کے حال و قال میں کتنا فرق آگیا ہے افسوس —

دل میں خاک اڑتی ہے خالی لہجہ ولب دیکھئے
مذہب اب رخصت ہے بس تاریخ مذہب دیکھئے

(۷۶)

سنہ ۱۹۱۳ء میں ہندوستان کا دارالسلطنت کلکتہ سے دلّی منتقل ہوا۔ نئی دہلی کی تعمیر بڑے زور شور سے ہو رہی تھی سنٹرل لیجسلیٹو اسمبلی جو اس زمانے میں امپریل کونسل کہلاتی تھی اس کے اجلاس بھی نئی دہلی میں ہونے لگے تھے اور کاؤنسل کے مسلمان ممبروں کے لئے ایک مسجد بھی بن گئی تھی۔

اس زمانے میں اکبر دلّی گئے ــــ اور ایک دن نئی دہلی کی اس مسجد میں نماز کے وقت پہنچ گئے ــــ دیکھتے کیا ہیں ایک پھٹے حالوں موذن صاحب اور دو تین نمازی جمع ہیں اور بس!

نماز پڑھ کر اکبر نے موذن سے پوچھا۔

کیوں بھائی سر .... بھی کبھی نماز پڑھنے آتے ہیں"

موذن نے جواب دیا ــــ "نہیں"

پھر پوچھا اکبر نے

اچھا۔ وہ نہ سہی تو خاں بہادر ....!

موذن نے نفی میں گردن ہلادی

اکبر نے کہا۔

"وہ بھی نہیں ــ ؟ تو آنریبل نواب .... تو ضرور ہی آتے ہوں گے"

غریب موذن نے صورت دیکھنا تو درکنار آج تک ان بڑے لوگوں کا نام بھی نہیں سنا تھا، ہکّا بکّا رہ گیا۔ اکبر کو اس کے تعجب پر کچھ زیادہ حیرت نہیں ہوئی اور کاؤنسل میں بہت سید ــــ مسجد میں فقط جمّن ــــ دوسرا مصرعہ لگا کر شعر پورا ہی کر لیا۔

اسلام کی رونق کا کیا حال کہوں تم سے
کونسل میں بہت سیّد، مسجد میں فقط جمّن

(۷۷)

اودھ کے ایک نومسلم تعلقدار نے اپنے گاؤں میں، ایک مسجد تعمیر کی، لکھنؤ سے ایک بڑے مولوی صاحب کو بلاکر مسجد کا افتتاح کرایا: دو چار دن مسجد میں نماز پڑھی، اور پھر اپنے کاروبار ریاست میں کھو گئے، ایسے کھوئے کہ مسجد کا خیال بھی نہ رہا گاؤں کے غریب مسلمانوں کے لئے یہ مسجد ایک نعمت غیر مترقبہ تھی ان لوگوں نے پانچوں وقت کی نماز با جماعت پڑھنا شروع کردی۔ ایک دن تعلقدار صاحب شام کے وقت ٹہلتے ہوئے مسجد کی طرف جا نکلے۔ مغرب کی اذان ہو رہی تھی، مسجد کو آباد دیکھ کر غصہ ہی تو آگیا، مقاصاحبوں سے پوچھا کہ یہ مسجد کس نے کھولی، لوگوں نے بتایا کہ اس میں گاؤں کے مسلمان نماز پڑھتے ہیں، تعلقدار صاحب کا ٹمپریچر اور بھی تیز ہو گیا، بپھر گئے اپنے دیہاتی لہجے میں بگڑ کر بولے۔

"ہم مسجد اپنے سوق کے لئے بنوا دا ہیں کہ ٹھلون کے نماز پڑھنے کے لئے"
(ہم نے مسجد اپنے شوق کے لئے بنوائی ہو کہ لفنگوں کے نماز پڑھنے کے لئے)

اکبر سے یہ لطیفہ ان کے ایک دوست نے لکھنؤ میں بیان کیا بہت ہنسے دیر تک ہنستے رہے اور ایک شعر اس واقعہ پر کہہ ہی ڈالا۔

شانِ نماز اکبر شاہانہ ہو چلی ہے
مسجد الگ بنائیں اپنی میاں بفاتی

(۷۸)

مدح صحابہ اور تبرّے کا جھگڑا غالباً سب سے پہلے ۱۹۰۵ء میں شروع ہوا تھا اور لکھنؤ میں "شیعہ سنی" اخبارات کی بنیاد بھی اس وقت سے پڑی۔ فساد ہوا۔ شیعہ اور سنی دونوں کو جانی و مالی نقصانات برداشت کرنا پڑے۔ اکبر اتحاد اسلامی کے اس سانحہ عظیم پر خاموش نہ رہ سکے۔

سنی و شیعہ میں جنگ اک دھوم دھامی ہو گئی
چار یار و پنجتن کی نیک نامی ہو گئی
ایک قرآن۔ ایک قبلہ۔ ایک اللہ۔ ایک رسول
بدنصیبی ہے کہ تفریق دوامی ہو گئی

(۷۹)

انیسویں صدی کے آخری قرن میں "نیچری" کی اصطلاح عام ہو چکی تھی۔ سرسید ان کے ساتھی اور علی گڑھ اس اصطلاح کے خاص "نشانہ" تھے اور جہاں کہیں "مغرب پسندی" کا شائبہ نظر آتا اسے "نیچریت" کہہ دیا جاتا تھا نواب محسن الملک مولوی مہدی حسین سرسید کے خاص ساتھیوں میں تھے اور مغربی تہذیب کے ایسے دلدادہ کہ "مغرب کی عریاں پسندی" کو لباسِ فطرت بنا دیا۔ مشرقی طرز کا پردہ ان کے نزدیک "ایام جاہلیت" کی ایک تاریخی یادگار تھا اکبر نے ان کے اسی نظریہ پر چوٹ کی ہے۔

پردہ کیا ہے خود اٹر ننگا پیدا
خود ہم نے کیا ازارِ "انگا پیدا
کیا خوب کہا ہے مولوی مہدی نے
فطرت نے کیا ہے ہم کو ننگا پیدا

(۸۰)

اکبر نے تمام زندگی سرسید اور علی گڑھ پر چوٹیں کی ہیں۔۔ لیکن ان کی ساری جد و جہد تعمیری تھی تخریبی نہیں! ان کا خیال تھا کہ یہ مغرب پسندی مسلمانوں کے قومی کردار کو داغدار بنا دیگی۔ لیکن اس "اصولی اختلاف" کو "ذاتیات" سے دور کا بھی علاقہ نہ تھا۔ اکبر ان کی مخلصانہ جد و جہد اور انتھک ایثار کے معترف تھے۔ چنانچہ ۱۸۹۸ء میں جب سرسید کا انتقال ہوا تو وہ اپنے دل کی گہرائیوں سے رو پڑے۔

ہماری باتیں ہی باتیں ہیں سیّد کام کرتا تھا
نہ بھولو فرق جو ہے کہنے والے کرنے والے میں
کہے جو چاہے کوئی۔ میں تو یہ کہتا ہوں اے اکبر
خدا بخشے بہت سی خوبیاں تھیں مرنے والے میں

(۸۱)

سرسید کے قومی خدمات کا اکبر کو ہمیشہ اعتراف رہا۔ سرسید کی وفات کے پانچ سال بعد ۱۹۰۳ء میں جب ان کے صاحبزادے "جسٹس سید محمود" کا انتقال سیتاپور میں ہوا تو اکبر اپنے دلی "تاثرات" کو نہ چھپا سکے:۔

نہ وہ "بک" رہ گئے نہ سرسیّد
دلِ احباب سے نکلتی ہے آہ
ذاتِ "محمود" سے تسلّی تھی!
لی انھوں نے بھی آج خلد کی راہ
بولی عبرت کہ خُلد میں آؤ
اے حریصانِ شان وشوکت وجاہ
مٹ گیا نقشِ "احمد و محمود"
رہ گیا لا الٰہ الا اللہ

(۸۲)

مسلمانوں کی "مادی ترقیوں" کا پرشور پروپیگنڈہ ہو رہا تھا ــــ اور زندگی کے ہر شعبے میں مسلمانوں کو سب سے آگے ثابت کیا جا رہا تھا۔ اسی زمانے میں ایک دن اکبر اپنے چند احباب کے ساتھ کہیں جا رہے تھے۔ راستے میں شراب خانے سے چند خانہ خراب مسلمان نکلتے ہوئے نظر آئے ــــ اکبر نے ساتھیوں کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

"دیکھا آپ نے مسلمانوں کی ترقی کا حال ــــ!"

مسجدیں چھوڑ کے جا بیٹھے ہیں میخانوں میں　　واہ کیا جوشِ ترقی ہے مسلمانوں میں

(۸۳)

مولانا ابوالکلام آزاد کا "الہلال" تحریکِ خلافت کے زمانے میں اچھی طرح حکومت

کی نگاہوں میں چڑھ گیا، مولانا آزاد اپنی "بے باک نگاری" اور "انگریز دشمنی" میں کبھی کسی سے نہیں ڈرے تحریر اور تقریر کے تمام حربے ہمیشہ حکومت کے خلاف استعمال کرتے رہے، الہلال کی باغیانہ تحریروں سے برطانوی حکومت کافی لرزہ براندام تھی چنانچہ ۱۹۱۴ء میں "الہلال" کی ضمانت ضبط کر کے اس کی زندگی ختم کر دی، اکبر مرحوم گو کہ سیاست سے ہمیشہ بے تعلق رہنے کی کوشش کرتے تھے مگر "الہلال" کے حادثۂ جانکاہ پر ان سے بھی صبر نہ ہو سکا فرماتے ہیں۔

مغرب کی برق ٹوٹ پڑی اس غریب پر
دورِ فلک "ہلال" کو لایا صلیب پر

(۸۴)

غالباً "الہلال" کے دورِ ادارت میں مولانا ابوالکلام آزاد نے اکبر سے غزل کی فرمائش کی۔ کئی بار تقاضے کے بعد جو غزل بھیجی اس کا مقطع تھا۔

ان کے پرچے کے لئے اکبر نے کہدی یہ غزل
شکر ہے اترا تقاضا حضرت آزاد کا

(۸۵)

سید جالب دہلوی (مرحوم) نے اودھ کے تعلقداروں اور روساء کے تعاون سے ۱۹۱۶ء میں لکھنؤ سے روزنامہ "ہمدم" جاری کیا، جالب مرحوم اکبر کے خاص دوستوں میں تھے اکبر بھی "ہمدم" کے اجرا پر اپنا پیغام تہنیت پیش کرتے ہیں۔

خوب ہے نام اس کا گر "ہمدم" رہے
دم نکلنے پر بھی باقی ہم رہے

(۸۶)

ایک ایڈیٹر صاحب جو ترکِ موالات کے زمانے میں برطانوی حکومت کے خلاف

خوب خوب لکھ رہے تھے یو پی حکومت نے "با دشمناں تلطف با دوستاں مدارا" کے مصداق ان کی زباں بندی کرنے کے لئے انھیں خرید لیا، ایڈیٹری سے سبکدوش کر کے ایک سرکاری عہدے پر ممتاز کر دیئے گئے، اور اس طرح پر وہ ایڈیٹر صاحب ہمیشہ ہمیشہ کے لئے خاموش ہو گئے، اکبر نے حکومت کی اس فریب کارانہ پالیسی پر مبارکباد دی۔

لیڈر یہ اب تو تنگ ہے وسعت پریس کی
خوش ہو جیئے کہ آپ کے فقرے میں آ گیا

(۸۷)

سنہ ۱۹۱۲ء میں اردو کے اخبار اور رسالوں میں "نمبر" نکالنے کا نیا شوق پیدا ہوا چنانچہ لاہور کے روزانہ "زمیندار" نے "پیمبر نمبر" نکالنے کا اعلان کر دیا، مولانا ظفر علی خاں ایڈیٹر "زمیندار" نے کئی تار اکبر کو دیئے کہ "پیمبر نمبر" کے لئے کچھ بھیجئے مگر یہ جدت اکبر کو ایک آنکھ نہ بھائی "پیمبر" پر نمبر ایک انوکھی بات تھی، اپنے روحانی دوست خواجہ حسن نظامی صاحب کو لکھا ایک خط میں۔

"زمیندار صاحب نے مجھ کو بھی ایک "اسامی" سمجھ رکھا ہے، تار پر تار آئے کہ پیغمبر نمبر کے لئے کچھ بھیجئے، اول تو "پیمبر" پر نمبر کیسا؟ اسی خیال سے چپ ہو رہا"

عہد انگلش میں ہے ہر چیز کے اندر نمبر
کیا تعجب ہے جو نکلا ہے پیمبر نمبر

(۸۸)

اکبر کی دور بینی اور زمانہ شناسی ہی ان کی شاعری کا ارتقاء کمال ہے۔ بدلتے ہوئے حالات کی طرف ان کی نگاہیں بہت تیزی کے ساتھ اٹھ جاتی ہیں، ہندی اردو کے جھگڑے کو وہ بہت گہری نظر سے دیکھ رہے تھے اور جس طرح انھیں یقین تھا کہ۔

انقلاب آیا، نئی دنیا نیا ہنگامہ ہے
شاہنامہ ہو چکا، اب وقت گاندھی نامہ ہے

اس طرح وہ جانتے تھے کہ اردو پر بھی ایک دن برا وقت پڑنے والا ہے اور وہ اس ذہنیت کے شدت کے ساتھ مخالف تھے کہ اردو دوستی کا جذبہ "ہندی دشمنی" کے رنگ میں رنگ جائے چنانچہ "ہندی ساہتیہ سمیلن الہ آباد" کی طرف سے شرکت کا دعوت نامہ آیا، اپنی خرابیٔ صحت کی وجہ سے شرکت نہیں کر سکے، عدم شرکت کے معذرت نامہ میں یہ شعر تحریر فرمایا

میری جانب سے ولیکن دل کو رکھئے مطمئن
بُت کا جو مداح ہو ہندی کا حامی کیوں نہ ہو

(۸۹)

اب تو اردو بیچاری کا ذکر بیکار ہے، مگر یادش بخیر، جب انگریزی سامراج ہندو مسلمانوں میں منافرت پھیلانے کے لئے اس ہندی کو جنم دے رہا تھا تو یوپی کا نیم سرکاری اخبار "لیڈر" الہ آباد اور اس کے نامور اڈیٹر مسٹر چنتامنی کافی پیش پیش تھے، اور اس سلسلہ میں لکھنؤ کے "ہمدم" اور لیڈر میں کافی نوک جھونک ہوا کرتی تھی ایک شام کو اکبر نے اپنے دوستوں کی صحبت میں اسی پر یہ قطعہ سنایا دوستوں کو

کہاں اُردو و ہندی میں زرِ نقد
وہی اچھا ہے جو گنتا "منی" ہے

مرے نزدیک تو بے سود یہ بحث
میانِ "ہمدم" و "چنتامنی" ہے

(۹۰)

اور اب تو "ہندوستانی" کھلم کھلا "ہندی" کے روپ میں آگئی سرکاری دفتر کچہریاں، ریڈیو، اسکول سبھی "ہندیا" دیئے گئے اسپتال اور دواخانے "آروگ شالے" بن گئے پوسٹ آفس "گھبیڑ پتر" ہوگیا، "استقبال" نے "سواگت" کے دامن میں پناہ لی ــــ "جناب" اور "صاحب" "شریمان مہودے" کے چرنوں پر جھک گئے ــــ

لیکن جب انگریز ہندو مسلمانوں میں نفرت پیدا کرنے کے لئے اس بناسپتی "ہندی" کو جنم دے رہے تھے اس وقت بھی لوگ اس خطرے سے بے خبر نہیں تھے۔ اکبر مرحوم نے اکثر مقامات پر اس "تباہ کن" تبدیلی کی طرف اشارہ کیا ہے۔ اور اپنے ایک دوست مولوی محمد عسکری وکیل کی "اردو دوستی" پر کہا ہے۔

اٹھیں اردو کی طرفداری میں بھائی عسکری
ہم تو کہتے ہیں بتوں سے "جس کیا تو تس کری"

؎ جیسا تم نے کیا ویسا میں نے کیا

(۹۱)

الہ آباد امپرومنٹ ٹرسٹ نے ایک نئی سڑک نکالنے کے لئے بہت سے مسلمانوں کے مکانات منہدم کروا دیئے الہ آباد بھر میں اس واقعے سے سراسیمگی اور اضطراب پھیلا ہوا تھا ہر شخص کی زبان پر یہی اذکار تھے ہر جگہ یہی چرچے! انگریزی عہد حکومت میں ہندوستان کے اندر اکثر یہی ہوتا تھا سرکاری ضرورتیں عام طور پر غریبوں سے پوری کی جاتی تھیں، چنانچہ حضرت اکبر پر بھی اس واقعہ کا کافی اثر تھا، کہا ہے۔

بے فائدہ ہے اکبر اب تم کو شوق اس کا
سائنس کی سڑک میں جنت بھی آگئی ہے

اور یہ دوسرا شعر بھی!

تنگ دنیا سے دل اس دور فلک میں آگیا
جس جگہ میں نے بنایا گھر سڑک میں آگیا

(۹۲)

نوجوانی کا زمانہ تھا اور شاعری کا نیا شوق اکبر اپنے استاد وحیدالدین وحید الہ آبادی کے ساتھ دریاباد (ضلع الہ آباد) ایک مشاعرے میں گئے ناسخ، قلق اور

منشی میر درد بھی اس مشاعرے میں شریک تھے طرح کچھ ایسی ہی تھی "تو سن میں"
گلشن میں، آہن میں
مشاعرہ شروع ہوا، اپنی ترتیب اور سلسلہ سے ایک کہنہ مشق بزرگ شمع کے سامنے
آئے، دو چار شعر پڑھنے کے بعد ایک شعر پڑھا۔

میں راضی قتل پر ہوں گر وہ مجھ کو اس طرح باندھیں
کہ رسی ہاتھ میں ان کے ہو پھندا میری گردن میں

ان بزرگ صورت شاعر کی اس "کہنہ مشقی" پر اکبر کی چلبلی طبیعت کسی طرح روکے نہ رک
سکی، شعر بار بار پڑھوایا گیا، کافی واہ واہ ہوئی، اکبر بھی سنجیدہ صورت بنائے داد دے رہے
تھے۔ جب "داد و ستائش" ختم ہوئی تو کہنے لگے۔" اور وہ دوسرا شعر بھی تو پڑھ دیجئے"
بڑے میاں سمجھے بچہ شوخیاں کر رہا ہے، کہنے لگے مجھے یاد نہیں!
اکبر بولے۔
حضور بھول گئے ہوں گے آپ کی اجازت سے میں پڑھے دیتا ہوں، دونوں شعر

میں راضی قتل پر ہوں گر وہ مجھ کو اس طرح باندھیں
کہ رسی ہاتھ میں ان کے ہو، پھندا میری گردن میں
مکاں اغیار سے خالی ہو، مجمع دوستوں کا ہو
کمر سے باندھ کر دامن نچاویں اپنے آنگن میں

اکبر کی اس برجستہ شرارت پر سارا مشاعرہ لوٹ لوٹ گیا اور وہ بیچارے پانی پانی ہو گئے

(۹۳)

سنہ ۱۹۱۰ء میں الہ آباد میں ایک عظیم الشان نمائش ہوئی تھی، کلکتہ کی مشہور رقاصہ "گوہر"
بھی آئی اور اس کے دیکھنے کے لئے خلقت کے ٹھٹھ کے ٹھٹ لگ گئے، مشہور تو یہاں تک
ہے کہ گوہر حضرت اکبر کی خدمت میں سلام کو حاضر ہوئی لیکن عشرت حسین مرحوم نے

اس واقعہ کی تردید کی ہے، بہرحال کچھ بھی ہو اکبر نے عوام کے بڑھتے ہوئے رجحانات کو اس میں نظم ہی کر دیا۔

خوش نصیب آج یہاں کون ہو گوہر کے سوا
سب کچھ اللہ نے دے رکھا ہے شوہر کے سوا

شائد اکبر ہی کی دعا کا اثر تھا کہ آخر عمر میں "گوہر" شوہر کے سوا سے نکل گئی اور اس نے شادی کر لی۔ اکبر کے تاثرات پورے ہوئے۔ "گوہر" جلد ہی شوہر والی بن گئی کہنے والوں نے کہا یہ آپ ہی کی دعاؤں کا اثر معلوم ہوتا ہے جو گوہر نے شادی کر لی۔

اکبر کی عاشقانہ طبیعت میں ایک لہر اٹھی ـــــ اور ان چند مصرعوں میں سمٹ گئی! کہا ہے۔

ہر دو پیچ نارس گیسو ہیں جس کے کالے
"گوہر" نے "آب" اپنی کر دی اسے حوالے
اکبر کے اب یہ مصرعے جس دھن میں چاہے گا لے

ہر گز حسد نہ بردم بر منصبے دمائے
لیکن براں کہ دارد از دلبرے دمائے

(۹۴)

آج ہندوستان کے چند نام نہاد مغرب زدہ "ترقی پسند نقاد" صرف اس لئے اکبر سے ناراض ہیں کہ وہ اب سے تیس چالیس سال ادھر بھی "مدخولہ گورنمنٹ" ہونے کے باوجود انگریزی تہذیب و معاشرت و مغربی تراش و خراش کو ہندوستانیوں کے لئے ایک بدترین لعنت سمجھتے تھے ـــــ بالکل وہی بات جو اس کے بہت دنوں بعد زبانی نہیں عملی طور پر گاندھی جی سمجھاتے رہے گر وہ تھے "بھارت پتا" اور یہ صرف اکبر ـــــ!

الہ آباد کے ایک "ایٹ ہوم" میں اکبر بھی اپنی دیسی وضع میں شریک تھے اور ان کے ایک دوست بھی ـــــ! جو سر سے پاؤں تک انگریزی دور غلامی کی نشانی، ہیٹ

سوٹ، بوٹ! لیکن کریہہ المنظر ایسے کہ انگریز تو انگریز شاید "بن مانس" بھی اس لباس میں کچھ زیادہ سجاتا — مگر ان پہ کچھ بھی اچھا نہیں لگتا، اکبر نے پورا قطعہ کہہ دیا، ان پہ۔

ہر چند کہ کوٹ بھی ہے پتلون بھی ہے

بنگلہ بھی ہے، پاٹ بھی ہے صابون بھی ہے

لیکن میں یہ پوچھتا ہوں تجھ سے ہندی

یورپ کا تری رگوں میں کچھ خون بھی ہے

(۹۵)

الہ آباد میں "واٹر ورکس" قائم ہوا — اور اسی کے ساتھ ہی "واٹر ٹیکس" بھی لگا دیا گیا۔ مسلمانوں کے نزدیک "پانی" کی قیمت وصول کرنا جائز نہیں ہے چنانچہ کسی مسلمان بادشاہ نے کبھی "آبیانہ" (محصول آبپاشی) وصول نہیں کیا۔ اکبر بھی اس "نئے ٹیکس" سے برداشتہ خاطر تھے — ایک شعر میں اس ٹیکس پہ کہا ہے۔

کشت دل کو نفع پہونچے اشک ایسی چیز ہے

دیدۂ گریاں پہ "واٹر ٹیکس" کی تجویز ہے

(۹۶)

ایک صاحب جنھوں نے بے شمار ڈگریوں کا بوجھ اپنی گردن پر لاد لیا تھا، اپنے زعم باطل میں اپنی اس "علامگی" پر پھولوں نہ سماتے تھے، بڑے بڑے تجربہ کار اہلِ ہنر کا مذاق اڑانا ان کے بائیں ہاتھ کا کھیل تھا۔

ایک دن حضرت اکبر کے سامنے اپنے علم و کمال کی ڈینگیں مارنے لگے، ان کے اس "برخود غلط" رویہ پر اکبر سے نہ رہا گیا، اپنا ایک قطعہ سنا ہی ڈالا۔

دلیلیں فلسفہ کی نور باطن کر نہیں سکتیں — کواکب کی شعاعیں رات کو دن کر نہیں سکتیں

ضروری چیز ہے اک تجربہ بھی زندگانی میں — تمھیں یہ ڈگریاں بڈھوں کا ہمسن کر نہیں سکتیں

(۹۷)

آخری عمر میں اکبر کی گھریلو زندگی کافی بدمزہ اور پھیکی ہوگئی تھی اس لئے وہ زیادہ تر الہ آباد سے باہر ہی رہتے۔ کبھی اپنے چہیتے صاحبزادے عشرت کے پاس ___ کبھی پریانواں (ضلع پرتاب گڑھ) اپنے سمدھیانے ۔کبھی دلّی خواجہ حسن نظامی کے یہاں اور کبھی کبھی لکھنؤ میں امین آباد کے کسی ہوٹل میں ہفتوں ٹھہرے رہتے۔ لکھنؤ میں اکثر لوگ ملنے کے لئے آجاتے۔

ایک مرتبہ لکھنؤ میں قیام فرما تھے ایک بزرگ صورت لکھنوی دوست ملنے کے لئے تشریف لائے، مہذب اور پڑھے لکھے آدمی تھے اور اکبر سے اچھی خاصی بے تکلفی بھی تھی، خالص لکھنوی لہجے میں "مذہبیات" پر گفتگو کر رہے تھے اور بات بات میں "واللہ" اور "واللہے" کی تکرار تھی ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے یہ "واللہ" اور "واللہے" ان کا تکیہ کلام بن چکا ہو۔ "واللہ" "واللہ" سنتے سنتے اکبر کے کان پک گئے، ہنسکر کہنے لگے، جناب آپ کی "واللہ" پر ایک شعر موزوں ہو گیا ہے سُن لیجئے۔

منطق بھی تو اک چیز ہے اے قبلۂ عالم
دے سکتی ہے کام آپ کی "واللہ" کہاں تک

(۹۸)

اکبر معتدل نظریات کے آدمی، جہاں وہ نئی تہذیب اور نئی روشنی کو انسانیت کے لئے "گھٹا ٹوپ" اندھیرا سمجھتے تھے وہاں اس دقیانوسی مولویت اور ملائیت کو بھی پسند نہیں کرتے تھے ان کی نظر میں معقولات کے آگے منقولات کی کوئی اہمیت نہیں تھی چنانچہ اخبار "ستارہ صبح" کے متعلق فرماتے ہیں۔

چار مہینے سے میں اخبار "ستارہ صبح" کو نہیں دیکھتا، کھولتا بھی نہیں اسی اندیشے سے کہ تنفر ہوگا۔ ظفر علی خاں صاحب کو مطلع نہیں کیا، کیا فائدہ، تو تو میں میں اور وہ بھی بے اثر

کتاب کی نقلیں دیکھنے سے کیا حاصل، مجھ کو قطعاً نہیں معلوم کہ کیا لکھا گیا ہے اور کیا لکھا جاتا ہے، تاجرانہ، ایڈیٹرانہ اور لیڈرانہ اظہارِ علم کچھ اثر نہیں رکھتا، چاہے قرآن ہی کی نقل کیوں نہ ہو۔

لاکھ چھانٹیں وہ مذہبی باتیں!
فرق ہے شیخیُ و کلرکی میں!

(۹۹)

سرسید اور ان کے اکثر ہم خیال اب سے تیس چالیس سال اُدھر نیچری کہلاتے تھے اور مسلمانوں کے عام مولویوں اور ملاؤں نے ان "نیچریوں" کو مسلمانوں کا چوہتّرواں فرقہ مشہور کر رکھا تھا۔ اکبر اسلام میں "ملائیت" کے قائل تو نہیں تھے لیکن اسلام کو کلیسائیت کے رنگ میں بھی دیکھنا پسند نہیں کرتے تھے وہ عوام سے ہٹ کر اپنا خود ایک نظریہ رکھتے تھے، مولانا عبدالماجد صاحب دریابادی بیان فرماتے ہیں کہ اپنے قیام لکھنؤ کے زمانے میں اکبر نے ایک رباعی سنا کر کہا میری زندگی میں اسے نہ چھاپ دیجئے گا نہیں تو مصیبت ہی ہو جائے گی مولوی صاحبان مجھ پر لٹھ لے کر دوڑ پڑیں گے۔ رباعی ہے۔

کتا جیسے بہ فکرِ حبیبہ دوڑے
یوں دہر پہ نیچری خلیفہ دوڑے
جب مر کے چلے ہیں سوئے جنت حضرت
لٹھ لے کے امام ابوحنیفہ دوڑے

(۱۰۰)

مولانا عبدالماجد صاحب دریابادی تحریر فرماتے ہیں:۔

آخر ۱۹۱۹ء سے میں نے مثنوی مولانا رومؒ کا والہانہ مطالعہ شروع کیا اور ۲۰ء و ۲۱ء میں کہنا چاہیئے کہ یہ دھن اپنے اوپر سوار تھی اور میں مثنوی میں مست تھا، حضرت اکبر کی خدمت میں مثنوی کا ذکر چھیڑا ایک بار پھر دوسری بار —— اور جب تیسری بار

یہی نام میری زبان پر آیا تو حضرت تڑسے بول اٹھے۔
"کیوں صاحب، یہ فرمائیے کہ اللہ میاں بڑے ہیں یا مولانا روم؟"
میں نے کھسیانے ہوکر کہا۔
"اللہ میاں"
بولے ــــــ
میں آپ کی گفتگو سے یہ سمجھتا تھا کہ شاید مولوی روم بڑے ہیں، جب سے آپ آئے ہیں بار بار انھیں کا ذکر کر رہے ہیں اللہ میاں کا نام میں نے ایک بار بھی نہ سنا۔

(١٠١)

مولانا عبدالماجد صاحب دریا آبادی نے تحریر فرمایا ہے:۔
سنہ غالباً ۱۹۱۸ یا ۱۹۱۹ ہے اکبر لکھنؤ میں امین الدولہ پارک کے ایک بالاخانے پر مقیم ہیں ایک صاحب جو بی، اے، ال ال بی اور اس وقت منصفی کے عہدے پر ممتاز تھے، صاحبانہ مسلک و خیال کے ساتھ ملنے تشریف لائے، گفتگو کچھ عورتوں کی تعلیم و آزادی پر چلی، اکبر نے کہا۔
"ہم تو اپنے زمانے میں آزاد خیالی کا امام سید احمد خاں (سرسید) کو سمجھتے تھے لیکن عورتوں کی آزادی انھیں بھی سخت ناپسند تھی۔"
وہ صاحب جیسے بھرے بیٹھے تھے بات کاٹ کر بولے ــــــ
"سرسید کی رائے اس معاملے میں سخت قابل ترمیم تھی۔"
اکبر برجستہ بول اٹھے۔
جی کیوں نہیں ــــــ ایک اسی معاملے میں کیا خدا معلوم کتنے معاملوں میں ان کی رائے قابل ترمیم تھی، وہ خود قابل ترمیم تھے، دیکھیے زمانہ نے انھیں کی ترمیم کر دی وہ گزر گئے اور ان کے بجائے آپ کو پیدا کر دیا۔

(۱۰۲)

مولانا عبدالماجد صاحب دریابادی نے تحریر فرمایا ہے۔

ذکر غالباً ۱۹۱۵ء کا ہے۔ اس خاکسار کو الہ آباد میں حضرت اکبر کے مہمان ہونے کا شرف حاصل تھا، اتفاق سے شیعہ کانفرنس کا جلسہ بھی اس زمانے میں الہ آباد میں ہو رہا تھا ___ ایک روز شب کے کھانے پر حضرت اکبر مسلمانوں کی زبوں حالی پر تاسف کر رہے تھے کہ ایک صاحب بول اٹھے

کچھ بھی سہی، بہر حال شیعوں سے تو ہماری اخلاقی و معاشرتی حالت بہتر ہی ہے

لسان العصر بولے ___ "جی کیا بات آپ نے پیدا کر دی ہے ہم ساری خدائی سے ذلیل سہی پھر بھی یہ اطمینان کچھ کم ہے کہ شیعوں کی حالت ہم سے ابتر ہے اور جب ہی تو میں نے عرض کیا ہے۔

ہر چند بے وقار ہیں مرزا پہ غم نہیں
کیا کم ہے یہ شرف کہ بقائی سے کم نہیں

(۱۰۳)

مولانا عبدالماجد صاحب دریاآبادی نے تحریر فرمایا ہے:۔

ایک روز میرے "دور الحاد" میں مجھ سے فرمانے لگے۔

"کیوں صاحب آپ کو کبھی اپنے بندے ہونے میں شک ہوا ہے؟ خدا کی بات کو الگ رکھیئے صرف اتنا پوچھتا ہوں کہ آپ بندے ہیں یا نہیں؟

عرض کیا ___

جی ہاں، کیوں نہیں، اس میں تو شک ہوا نہیں؟

بولے ___

بس پھر بیڑا پار ہے اسی بندگی کا احساس کرتے رہیئے آپ کے لئے یہی کافی ہے"

خدا کے عرفان کا دعویٰ کون کر سکتا ہے جنھوں نے جانا ہے انھوں نے بھی کیا جانا ہے، میر کا ایک شعر سُن لیجئے۔

درد تو موجود ہے دل میں شفا ہو یا نہ ہو

بندگی حالت سے ظاہر ہے خدا ہو یا نہ ہو

(۱۰۴)

مولانا عبدالماجد دریاآبادی ایک زمانے میں کچھ ایسے فلسفے کی گتھیوں میں اُلجھے کر "کفر و الحاد" کی دنیا میں پہونچ گئے، اکبر سے ان کے تعلقات بہت ہی مخلصانہ تھے ـــ اور اکبر اچھی طرح جانتے تھے کہ جوانی کی اس ترنگ میں کسی نہ کسی دن ایک ٹھہراؤ ضرور پیدا ہوگا عبدالماجد پھر "عبد ماجد" بنیں گے، چنانچہ انھوں نے پیشین گوئی کی ـــ جو آج حرف بحرف بھی ثابت ہو رہی ہے۔

ماجد کو آپ کہئے گا بیگانۂ شریعت

دل میں تو میرے اک ہے امید کا قصیدہ

وہ غالباً ہیں مصداق اس شعر بااثر کے

ارشاد کر گیا ہے اک عبد برگزیدہ

من پاکباز عشقم ذوقِ فنا چشیدہ

آہوئے دشت ہوئم از ناسوا رمیدہ

(۱۰۵)

مولانا عبدالماجد دریاآبادی کے ماموں مولوی محمد کریم اکبر کے بے تکلف دوستوں میں تھے۔ سنہ ۱۹۰۵ء میں وہ بحیثیت تحصیلدار الہ آباد کی تحصیل "میجا" میں تعینات تھے، اکبر کی فرمائش پر بطور تحفہ مولوی صاحب نے انھیں ایک مچھلی بھیجی۔ تحفہ کی رسید دیتے ہوئے اکبر نے لکھا۔

عمدہ مچھلی مسلّم و خام ملی   تحفہ پایا۔ مرادِ خدام ملی

ممنون "کرم" کیوں نہ ہوں اے اکبر　　وہ دام میں لائے مجھے بے دام ہی

ے یہ پرچہ ۳ر دسمبر ۱۹۰۵ء کا لکھا ہے۔

(۱۰۶)

مولوی قمر الدین صاحب بدایونی "مصنف" بزم اکبر" تحریر فرماتے ہیں۔

۱۳ر اکتوبر ۱۹۱۹ء

مولوی رضا حسین صاحب سیر منشی سے ملاقات کرنے گاڑی میں جا رہے تھے میں ساتھ تھا. . . . مولوی رضا حسین صاحب کے یہاں سے واپسی پر راستے میں "کالون ہسپتال" پڑا، میں نے کہا آج کل "انفلوئنزا" کے مریضوں سے تمام ہسپتال بھرا رہتا ہے۔ اس پر کچھ غور کیا اور فرمایا سنو!

انفلوئنزا سنا آیا یہاں اسپین سے
اے خدا ہم کو تو تو محفوظ رکھ اس ہین سے

(۱۰۷)

"بزم اکبر" کے مصنف مولوی قمر الدین احمد صاحب بدایونی جو اکبر مرحوم کے خاص ندیم اور ہر وقت کے اٹھنے بیٹھنے والے لوگوں میں تھے ایک مرتبہ "سائیکل سے گر کر زخمی ہو گئے ایک ہفتے تک صاحب فراش رہے اور اکبر مرحوم کے پاس نہ پہونچ سکے، آٹھ دس دن کے بعد پہنچے تو اکبر نے "بائیکل کی خیریت پوچھی اور اظہار افسوس کرتے ہوئے فرمایا ـــ برا ہوا اجی مجھے خواہ کوئی قدامت پسند کہے یا قدامت پرست؟ مجھے تو عہد حاضرہ کی اچھی سے اچھی ایجاد میں بھی مضرت کے پہلو نظر آتے ہیں خواہ وہ موٹر ہو، ہوائی جہاز ہو یا بائیسکل"!

پھر کچھ سوچ کر کہنے لگے ـــ اور یہ بائیسکل تو مجسم روگ ہے "مرض" بائی (Bai) سے شروع ہوتا ہے پھر "سک" (sick) ہوتا ہے اور پھر "اِل" (ill) ہوتا ہے، اس طرح پہ یہ لفظ "بائیسکل" بنتا ہے۔

(۱۰۸)

"بزم اکبرؒ" کے مصنف مولوی قمرالدین احمد بدایونی تحریر فرماتے ہیں۔

سید صاحب (اکبر) اور ان کے ایک پڑوسی میں ایک مکان کے متعلق کچھ مقدمہ بازی ہو رہی تھی اس سلسلہ میں میرے مکان پر کٹرے تشریف لائے اور جناب والد صاحب سے فرمایا کہ بابو دوارکا پرشاد مفرم جج سے سفارش فرما کر مقدمہ کا اجلاس تبدیل کرا دیں ان کا ملازم سلیمان بھی ساتھ تھا، والد صاحب نے شربت پیش کیا، سلیمان کو بھی دیا۔ وہ بیچارہ ہچکچانے لگا اس کے تامل کو دیکھ کر فرمایا۔

"سلیمان لے لو، وہیں سے تخت پر بیٹھ کر پی لو۔"

(۱۰۹)

الہ آباد سے اکبر نے ڈاکٹر اقبال کو "لنگڑے آموں" کا ایک پارسل بھیجا، اقبال نے آموں کے بخیریت پہنچنے پر رسید بھیجی اور شکریہ بھی!

اکبر کو الہ آباد سے لاہور تک بخیریت "آم" پہونچنے پر کافی تعجب ہوا کم از کم اس زمانے میں ایسے پارسلوں کا اتنا بڑا سفر اور وہ بھی "بخیریت معجزہ ہی تھا۔

اکبر نے ڈاکٹر اقبال کے خط کا جواب لکھا اور اپنے تعجب کا اظہار کیا۔

اثر یہ تیرے انفاس مسیحائی کا ہے اکبرؔ
الہ آباد سے "لنگڑا" چلا لاہور تک پہونچا

(۱۱۰)

اکبر ڈاکٹر اقبال کو ایک مخلص دوست، سنجیدہ مجدد اور اچھا مفکر تو مانتے تھے مگر ان کے نظریات کی کورانہ تقلید جائز نہیں سمجھتے تھے۔ خواجہ حسن نظامی کو ایک خط میں لکھا ہے۔

"اقبال صاحب نے بہت ترقی کی ہے، ان کو ضرورت ہے، میں یہ لکھ دوں گا۔

آپ کے ہاتھ میں میں ہاتھ نہیں دے سکتا   داد دیتا ہوں، مگر ساتھ نہیں دے سکتا

(۱۱۱)

جب یورپ میں ڈاکٹر اقبال کی مثنوی "اسرارِ خودی" اور "رموزِ بے خودی" کا ترجمہ ہوا تو سارے ہندستان میں دھوم مچ گئی انھیں ترجموں کی بدولت ڈاکٹر اقبال "شاعرِ مشرق" بن گئے اپنی خوبیوں پر غیروں کی مدح وستائش کا سہارا اکبر کو ایک آنکھ نہ بھایا، ان کا خیال تھا کہ فارسی زبان اور ایشیائی فلسفۂ عرفان کو اہلِ یورپ ہم سے اچھا نہیں سمجھ سکتے پھر اس تعریف پر بغلیں کیوں بجائی جائیں۔

کہتے ہیں ؎

رقیب سرٹیفکٹ دیں تو عشق ہو تسلیم
یہی ہے عشق تو اب ترکِ عاشقی اولیٰ

(۱۱۲)

ڈاکٹر اقبال کے مشہور ترانے "ہندستاں ہمارا" کی دھوم مچی ہوئی تھی۔ نصاب کی ہر کتاب میں یہ ترانہ جگہ پا چکا تھا اور ہر بچے کی زبان پر —

"سارے جہاں سے اچھا ہندوستاں ہمارا"

ہی تھا۔ کہنے لگے سنتے سنتے کان پک گئے ہیں اب تو کوئی ایسا نعرہ ہونا چاہیئے۔

کالج میں ہو چکا جب یہ امتحاں ہمارا
سیکھا زباں نے کہنا "ہندوستاں ہمارا"
رقبے کو کم سمجھ کر اکبر یہ بول اٹھا
ہندوستان کیسا؟ سارا جہاں ہمارا

(۱۱۳)

مئی ۱۹۱۴ء کے ماہنامہ "نقاد" آگرہ میں ڈاکٹر اقبال کی جدید شاعری پر ایک مضمون (اقبال اکبر کے رنگ میں) لکھا تھا جس میں یہ ثابت کیا گیا تھا کہ ڈاکٹر اقبال

کے نئے قطعات جو "گھوڑے" کے عنوان سے روزنامہ زمیندار لاہور میں شائع ہو رہے ہیں وہ دراصل اکبر کا تتبع ہے ـــــ اقبال کا پہلا "گھوڑا" تھا

مشرق میں اصولِ دین بن جاتے ہیں
مغرب میں مگر مشین بن جاتے ہیں
رہتا نہیں ایک بھی ہمارے پلے
واں ایک کے تین تین بن جاتے ہیں

بحث کچھ طول کھینچ ہی رہی تھی کہ اگست کے "نقاد" میں اکبر نے ایک دو شعر بھیج کر اس بحث کو ختم کر دیا۔

"اقبال" کو دین کی اشاعت کی ہے دھن
جائز تھا کہ "نون" کا وہ اعلان کریں
"نقاد" کو بت پرست شعروں کا ہے شوق
وہ چاہتے ہیں اسے مسلمان کریں

(۱۱۴)

ڈاکٹر امرناتھ جھا ایک واقعہ بیان کرتے ہیں:۔

مجھے کئی بار انھیں دیکھنے کا فخر حاصل ہوا لیکن میں صرف ایک بار دو محترم دوستوں کے ساتھ ان سے ملنے ان کے گھر پر حاضر ہوا، افسوس یہ دونوں حضرات مسٹر کچلو اور مولوی نظیر انتقال فرما چکے، وہ ہم سے بڑی بے تکلفی سے باتیں کرتے رہے، وہ اپنے بیٹے عشرت سے ملنے حال ہی میں پرتاب گڈھ گئے تھے۔ اس ملاقات کا مفصل طور پر ذکر کرتے رہے اور ہم لوگوں کو ایک گھنٹہ تک اپنی باتوں سے مسحور کئے رکھا ـــ اس وقت وہ اپنی زندگی کے آخری سال میں تھے لیکن ان کی گفتگو کی جانداری اور ولولے سے ان کے آنے والے انجام کا ہلکا سا اشارہ بھی نہیں ملتا تھا۔

ہم نے پوچھا۔
"پرتاب گڈھ کے لوگوں نے آپ کا دھوم دھام سے خیر مقدم کیا ہوگا"
حضرت اکبر نے ہنس کر ایک لطیفہ بیان کیا:۔
ایک دفعہ خدا نے شہر لندن کی سیر کی، دن بھر سرگرداں رہے گلی گلی کی خاک چھانی دربدر دستک دیتے پھرے اور ایک ایک سے کہتے رہے کہ بھائی میں تمہارا پیدا کرنے والا رب ہوں خالق ہوں ـــــ خدا ہوں مگر کسی نے ان کی ایک بات بھی نہ سنی، ہر جگہ دھکے دے کر نکال دیئے گئے، کسی نے پینے کو پانی تک نہیں دیا۔ آخر ش بھوکے پیاسے تھکے مارے ایک مکان میں جا داخل ہوئے شدت سے پیاس لگی تھی فرمایا ـــــ
"مجھے تھوڑا پانی پلاؤ میں یسوع مسیح کا باپ ہوں"
یہ سن کر گھر کے مالک نے ان کی بڑی آؤ بھگت کی اور خاطر تواضع کی بارش نے انھیں ششدر کر دیا بھائی یہی حال میرا ہوا پرتاب گڈھ میں ـــــ کسی نے اکبر کی طرف پھوٹی آنکھوں سے بھی نہیں دیکھا ـــــ لیکن ڈپٹی صاحب (یعنی عشرت مرحوم) کے والد کی بڑی قدر ہوئی،

(۱۱۵)

اکبر کی بدیہہ گوئی اور برجستگی کے متعلق ڈاکٹر امر ناتھ جھا ایک واقعہ تحریر فرماتے ہیں۔
"کسی نے اکبر سے فرمائش کی کہ ایک ایسا شعر کہہ دیجیے، جس میں "کچلو" کا قافیہ آ جائے"
اکبر نے اس وقت فی البدیہہ یہ شعر نظم کر کے سنا دیا۔

کوئی جا کے کہہ دو "کچلو" سے
ہم سب ہو گئے ہیں "زچ لُو" سے

جب یہ شعر سنایا تو اس زمانے میں بلا کی گرمی پڑ رہی تھی اور "گویا الہ آباد کی "لو" آدمی تو آدمی زمین و آسمان جھلسے جا رہے تھے۔

(۱۱۶)

ہندوستان کو سائنس اور نیچر سے نیا نیا سابقہ تھا اور اس وقت تک سائنس کی جو "تھیوری" یہاں پہونچی تھی وہ ڈاروِن کی "تھیوری" انسانی ارتقاء ___ اور اس نظریہ پر حیرت انگیز دل چسپیاں لی جا رہی تھیں کہ ایک اور جدید انکشاف یورپ سے آگیا۔ ہڈیوں میں فاسفورس (یعنی گن دھک) ہوتا ہے پھر کیا تھا اس پر بھی مذہبی نکتہ نظر سے بحثیں شروع ہوگئیں، حضرت اکبر بھی ان دل چسپی لینے والوں میں شریک تھے، فرماتے ہیں۔

دل میں اب نورِ خدا کا ذکر کیا
ہڈیوں میں فاسفورس دیکھئے

(۱۱۷)

اکبر ہر جدت پر پھڑک اٹھتے تھے ۱۹۱۶ء میں مہاراجہ صاحب محمود آباد (سر محمد علی محمد خاں صاحب مرحوم) نے علامہ سلیمان ندوی مرحوم اور مولانا عبدالماجد دریاآبادی کے تعاون سے "اردو انسائیکلوپیڈیا" کا کام شروع کرانے کا اعلان کیا مہاراجہ صاحب اس کام پر ایک لاکھ روپیہ صرف کر رہے تھے اعلان دیکھتے ہی اکبر کی جولانی طبع میں ایک ہل چل سی مچ گئی ایک قطعہ کہہ ہی ڈالا۔

خدا نے جو غیرت عطا کی ہو تم کو
تو ملت کے اعلیٰ مقاصد کو دیکھو

اولوالعزمئ راجہ صاحب کو سمجھو
مذاقِ سلیمان و ماجد کو دیکھو

(۱۱۸)

کچھ مسلم کالج علی گڑھ کے چھوٹے چھوٹے اختلافات! کچھ یوپی کے گورنر سر جیمس مسٹن کی علی گڑھ کالج سے خفگی! انھیں باتوں نے مل جل کر لکھنؤ میں "شیعہ کالج" کی بنیاد ڈالی

دی مرحوم مہاراجہ صاحب محمود آباد کا نظریہ اس سلسلہ میں عام شیعوں سے جداگانہ تھا
اسی زمانے میں اکبر لکھنؤ میں ٹھہرے ہوئے تھے مہاراجہ صاحب کی پارٹی کے ایک صاحب
اکبر سے ملنے کے لئے آئے، شیعہ کالج کا ذکر چھڑ گیا، وہ صاحب فرمانے لگے ــــ

یہ تو علی گڑھ کے جواب میں ڈیڑھ اینٹ کی مسجد بنانا ہوا۔

حضرت اکبر نے جواب دیا۔
جی نہیں ــــ یہ علی گڑھ پر حملہ کیوں ہوا، جتنے نئے کالج بنتے جائیں گے علی گڑھ کو
اور تقویت ہی ہوتی جائے گی، میں نے ایک شعر کہا ہے۔

سیّد صاحب کو عذر کیوں ہونے لگا
کالج ہے یہ کچھ امام باڑہ تو نہیں؟

(۱۱۹)

سر مہاراجہ محمد علی محمد خاں ساحر (آف محمود آباد) ایک ذی علم سخن فہم اور سخن سنج
ہی نہیں تھے بلکہ ایک بلند پایہ شاعر بھی تھے ان کا دربار ہمیشہ علم وفن کے جواہر پاروں
سے مالا مال رہا۔ لسان الہند عزیز لسان الملک ریاض اور میرزا ثاقب تو تمام عمر
اسی بارگاہ علم سے وابستہ رہے۔ ریاض کو تو سر مہاراجہ کے ایک شعر نے اتنا مسحور کر دیا
تھا کہ اسی زمین میں غزل لکھنے پر مجبور ہو گئے ــــ اور ریاض نے بھی اسی غزل میں
سر مہاراجہ کے ایک شعر کو "قطعہ بند" کرا دیا۔

مرے "حضور کے اس شعر کا جواب نہیں
بہت ہی خوب کہا ہے "خمار" باقی ہے (ریاض)
جو آج پی ہو۔ تو ساقی حرام شے پی ہو
یہ کل کی پی ہوئی مے کا خمار باقی ہے (سر مہاراجہ)

سر مہاراجہ اکبر کے قدر شناسوں میں بھی تھے۔ کبھی کبھی اکبر اپنی تازہ غزلیں

اور قطعات انھیں بھیجا کرتے تھے۔ سر مہاراجہ کا حافظہ اتنا اچھا تھا کہ جو شعر توجہ سے سن لیتے تھے یاد ہو جایا کرتا تھا۔ اکبر کے کافی اشعار انھیں یاد تھے اور ان کا استعمال اتنا برمحل کرتے تھے کہ سننے والے یہ محسوس کرنے لگتے کہ یہ شعر اسی موقع کے لئے کہا گیا ہے۔ اکبر نے سر مہاراجہ کو ایک رباعی بھیجی جس میں ان کے کسی کمال ذہانت کی داد دی ہے۔

ہیں حضرت "ساحر" آج اک حسن کمال
ہے مخزن حکمت و خرد ان کا خیال
اشعار اکبر کے کیوں نہ ہوں یاد انکو
راجہ کے گھر میں موتیوں کا کیا کال؟

(۱۲۰)

اپنے اس شعر کے سلسلہ میں :۔

کمیٹی میں چندہ دیا کیجیے
ترقی کے ہجے کیا کیجیے

کہا کرتے تھے ۔۔۔ کمیٹی کے معنی ہیں "بیا بخور" یعنی کمیٹی مرکب ہے کم (come) اور ایٹی (EAT) سے کم کے معنی ہیں "بیا" اور "ایٹ" (EAT) کے معنی "بخور" آؤ اور کھاؤ" کمیٹی میں وہی لوگ ہوتے ہیں عام طور پر جو دعوتیں بھی کھاتے ہیں اور چندہ کا روپیہ بھی!

(۱۲۱)

"چندن" اور کمیٹی سے اللہ واسطے کا بیر ۔۔۔ اور مصیبت آئے دن یہی ایک روز کچھ حضرات آئے، کہنے لگے حجاز کے سفر میں حاجیوں کو سخت تکلیفوں اور مصیبتوں کا سامنا کرنا پڑ رہا ہے وہاں کی حکومت ٹیکس اور چڑھاوے تولے لیتی ہے

مگر حجاج کو طبی امداد تک نہیں پہونچاتی، اسی لئے سینکڑوں حاجی موت کا شکار ہوجاتے ہیں، ہم لوگوں نے حجاج کو سہولت اور آرام پہونچانے کے لئے ایک کمیٹی بنائی ہے جو وہاں حاجیوں کو طبی امداد دے گی اور دوسری آسائشوں کا بھی خیال رکھے گی آپ بھی اس کار خیر میں ہاتھ بٹائیے اور چندہ عنایت فرمائیے۔

پہلو بدل کر بیٹھے اور کہنے لگے۔

سنئے صاحب میں تو اسے نیک کام نہیں سمجھتا، یہ تو ایک قسم کا گناہ ہے آپ کو کس نے یہ مشورہ دیا ہے، آپ خود بھی یہ ایک قسم کا گناہ کر رہے ہیں اور دوسروں کو بھی اس میں شریک کرنا چاہتے ہیں۔

ابھی ہر نیکدل حاجی کی یہی تمنا ہوتی ہے کہ مکہ معظمہ یا مدینہ منورہ میں جاکر مر جائے پھر آپ کون ہیں اس کے اس نیک ارادے میں روڑے اٹکانے والے، جائیے اپنے گھر بیٹھئے جاکر دنیا کو اس گناہ میں شرکت کی دعوت نہ دیتے پھریئے، اگر میرا یہ مشورہ آپ کے لئے قابل قبول نہیں ہے تو کم از کم مجھے تو معاف ہی فرمایئے اس گناہ سے۔

یہ سن کر وہ حضرات اپنا سا منہ لے کر چپ چاپ واپس گئے۔

(۱۲۲)

مولانا شبلی ایک مرتبہ اکبر سے ملنے کے لئے گئے ـــ جمعہ کا دن تھا نماز کا وقت آیا تو اکبر مرحوم اور مولانا نماز جمعہ کے لئے مسجد کی طرف روانہ ہوئے یہ لوگ دروازے سے نکل رہے تھے اور عشرت مکان میں داخل ہو رہے تھے، عشرت نے یہ دیکھ کر کہ یہ لوگ نماز کے لئے جا رہے ہیں نگاہ بچانے کی کوشش کی اور منظر خود بخود ایک دلچسپ ماحول میں تبدیل ہو گیا اکبر کی جولانی طبیعت نہ رک سکی ٹھہر گئے، عشرت کو آواز دی اور مولانا شبلی کو مخاطب فرماتے ہوئے فی البدیہہ یہ شعر سنایا، عشرت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے۔

بے نمازوں میں ہیں یہ اور اس پہ شرماتے نہیں
خیریت یہ ہے کوئی لوٹے کو گرماتے نہیں

(۱۲۳)

ایک مرتبہ اکبر نے شبلی کو کھانے پر مدعو کیا اور لکھا۔

آتا نہیں مجھ کو قبلہ قبلی
بس صاف ہے یہ کہ بھائی شبلی
تکلیف اٹھاؤ آج کی رات
کھانا یہیں کھاؤ آج کی رات
حاضر جو کچھ ہو دال دلیا
سمجھو اس کو پلاؤ قلیا

شبلی نے اس "رقعہ منظوم" کا جواب بھی منظوم دیا۔

آج دعوت میں نہ آنے کا مجھے بھی ہے ملال
لیکن اسباب کچھ ایسے ہیں کہ مجبور ہوں میں
آپ کے لطف و کرم کا مجھے انکار نہیں
حلقہ در گوش ہوں ممنون ہوں مشکور ہوں میں
لیکن اب وہ میں نہیں ہوں کہ پڑا پھرتا تھا
اب تو اللہ کے افضال سے "تیمور" ہوں میں
دل کے بہلانے کی باتیں ہیں وگرنہ شبلی
جیتے جی مردہ ہوں مرحوم ہوں مغفور ہوں میں

جس زمانے کا یہ واقعہ ہے شبلی کا ایک پاؤں بندوق کے حادثے میں بیکار ہو چکا تھا

(۱۲۴)

حضرت اکبر چاہتے ہوں یا نہ چاہتے ہوں مگر یہ واقعہ ہے کہ انھیں اپنے صاحبزادے "عشرت حسین" (مرحوم) کو تعلیم کے لئے یورپ بھیجنا پڑا مگر چلتے وقت بہت سے عہد و پیمان لے لئے ان سے۔

عشرت حسین مرحوم کافی عرصہ تک یورپ میں تعلیم حاصل کرتے رہے! ان دنوں ہر انگلستان جانے والے ہندوستانی نوجوان کے متعلق یہ شبہ کیا جاتا تھا کہ وہ یورپ کی رنگینیوں سے بچ کر نہیں آسکتا اور اکثر ہوتا بھی یہی تھا کہ انگلستان سے واپس آنے والا ہر نوجوان اپنے ساتھ کوئی یوروپین لیڈی ضرور لاتا۔ اکبر نے عشرت کو انگلستان

"بھیج تو دیا مگر کھٹکا لگا ہوا تھا چنانچہ ایک مرتبہ عشرت کے خط آنے میں کچھ غیر معمولی دیر ہو گئی تو ان کی فکر و تشویش اور بھی بڑھی، خط لکھا۔ اور ایک قطعہ بھی نظم کر کے بھیج دیا۔

عشرتی گھر کی محبت کا مزا بھول گئے
کھا کے لندن کی ہوا عہدِ وفا بھول گئے

پہونچے ہوٹل میں تو پھر عید کی پروا نہ رہی
کیک کو چکھ کے سوئیوں کا مزا بھول گئے

موم کی پتلیوں پر ایسی طبیعت پگھلی
چمنِ ہند کی پریوں کی ادا بھول گئے

کیا تعجب ہے جو لڑکوں نے بھلایا گھر کو
جبکہ بوڑھے روشِ دینِ خدا بھول گئے

(۱۲۵)

ایک دن فرمانے لگے ——
عشرت کے لڑکے عقیل (اکبر کے پوتے) نے آج بڑی ذہانت کا ثبوت دیا، میں نے ایک مصرعہ کہا تھا دوسرا مصرعہ نہیں ہوا تھا، پہلا مصرعہ سنا تو برجستہ دوسرا مصرعہ موزوں کر دیا۔

میرا مصرعہ تھا۔
"تم ترکِ موالات کرو، ریل نہ چھوڑو"

اس نے مصرعہ لگایا۔
"صاحب سے ہو بیزار مگر میل نہ چھوڑو"

(۱۲۶)

اپنے سب لڑکوں میں اکبر عشرت حسین کو سب سے زیادہ چاہتے تھے ان کی تعلیم و

تربیت پر کافی خرچ کیا تھا، عشرت کی شادی پریانواں (ضلع پرتاب گڈھ) کے تعلقدار خاں بہادر نواب احمد حسین خاں مذاق مرحوم کی لڑکی کے ساتھ ہوئی تھی، اپنی زندگی کے آخری ایام میں اکبر اپنی گھریلو کش مکش سے گھبرا کر کبھی لکھنؤ، کبھی دلی، کبھی پرتاب گڈھ اور کبھی پریانواں چلے جاتے، کوشش کر کے عشرت نے بھی اپنا تبادلہ پرتاب گڈھ میں کرا لیا تھا اور وہیں بحیثیت ڈپٹی کلکٹر تعینات تھے، اسی لئے زیادہ قیام پرتاب گڈھ ہی میں رہتا تھا۔ الہ آباد کے ایک پرانے اور مخلص دوست نے اس "جلا وطنی" کا شکوہ کیا کہنے لگے بھائی کیا کروں۔

پرتاب گڈھ میں عشرت، پریانواں میں ہیں سمدھی
اکبر کے بازوؤں میں دو پر لگے ہوئے ہیں

(۱۲۷)

اکبر کے چھوٹے صاحبزادے "ہاشم" نے اپنے بڑے بھائی "عشرت" سے گیند بلے کی فرمائش کی۔ اکبر کو پتہ چلا تو بہت ناراض ہوئے۔ اپنی خفگی کا اظہار چار مصرعوں میں کیا ہے۔

روپے کو اپنے کریں صرف وہ جو غلے میں
تو کام آئے غریبوں کے اس محلے میں
یہ کام مجھ کو تو اے "ہاشمی" پسند نہیں
کہ صرف دولت عشرت ہو "گیند بلے" میں

(۱۲۸)

عشرت کو لندن بھیجنے سے پہلے "رشتۂ ازدواج" میں منسلک کر دیا تھا۔ زمانے کا رنگ دیکھتے ہوئے ڈر رہے تھے کہ کہیں انگلستان سے کوئی "دم چھلا" نہ لگا لائیں۔

پریانواں (ضلع پرتاب گڈھ) کے تعلقدار نواب احمد حسین خاں کی صاحبزادی کے ساتھ نکاح ہوا تھا۔ رخصتی عشرت کی لندن سے واپسی پر طے پائی تھی۔۔۔ مگر وہ لندن کی دلچسپیوں

میں کچھ ایسے محو ہوئے کہ گھر کا راستہ ہی بھول گئے نواب صاحب کی طرف سے رخصتی کے تقاضے
اکبر کا واپسی پر اصرار ۔ اور ادھر ایک جیب میں سو سو ہلائیں ٹالی جا رہی تھیں۔ جب اکبر
کے کئی خطوط کا جواب عشرت نے نہیں دیا تو اکبر نے انھیں لکھا۔

لندن کو چھوڑ لڑکے اب ہند کی خبر لے
بنتی رہیں گی باتیں آباد گھر تو کر لے
راہ اپنی اب بدل دے ۔ بس پاس کر کے چل دے
اپنے وطن کا رخ کر اور رخصت سفر لے
انگلش کی کر کے کاپی ۔ دنیا کی راہ ناپی
دینی طریق میں بھی اپنے قدم کو دھر لے
واپس نہیں جو آتا ۔ کیا منتظر ہے اس کا؟
ماں خستہ حال ہو لے ۔ بیچارہ باپ مر لے
مغرب کے مرشدوں سے تو پڑھ چکا بہت کچھ
پیرانِ مشرقی سے اب فیض کی نظر لے
میں بھی ہوں اک سخنور ۔ آسُن کلام اکبر
اِن موتیوں سے آکر دامن کو اپنے بھر لے

(۱۲۹)

لسان الہند مرزا محمد ہادی عزیزؔ لکھنوی اکبر کے ان عزیزترین دوستوں میں تھے جن سے
مرتے دم تک اکبر کے مخلصانہ تعلقات استوار رہے۔ شعراء لکھنؤ میں اکبر عزیز ہی کو ایک
صاحب فن اور مکمل شاعر تسلیم کرتے تھے چنانچہ جب عزیز کا دیوان "گلکدہ" شائع ہوا تو
لکھا اکبر نے۔

سخن میں اور تو اہلِ تمیز ہی ہیں فقط   شہید جلوۂ معنی عزیزؔ ہی ہیں فقط

ایک دوسرے قطعے میں فرماتے ہیں۔

ایک ہی کر دیا محبت نے خود کو۔ ان کو کبھی نہ دو سمجھے؟
لوگ کہتے ہیں زندگی کو عزیز زندگی ہم عزیز کو سمجھے؟

ہے خدا کا بھی اسم پاک عزیز
وجد میں آئے وہ۔ یہ جو سمجھے

(۱۳۰)

عزیزؔ لکھنوی فرمایا کرتے تھے۔
"میں شعر اپنے لئے کہتا ہوں"
اکبر بھی اسی خیال کے حامی تھے۔ کہتے ہیں۔

نہ میر کے لئے اور نہ تیر کے لئے نہ اشعار ہیں یہ صلے کیلئے
بہت خوب ہے قول ہادی عزیزؔ کہ میں شعر کہتا ہوں اپنے لئے

(۱۳۱)

جناب سید محمد عسکری وکیل بھوپال نے بیان کیا۔
میں نے اکبر کو لکھا کہ یہ کیا قیامت ہے کہ لوگ "ناسخ"[۱] کو شاعر اور استاد مانتے ہیں حالانکہ ان کے رنگ تغزل کو شعریت سے کوئی لگاؤ نہیں۔

اکبر نے جواب میں لکھا۔
تم نے میرا یہ شعر تو ضرور پڑھا ہوگا؟ لیکن شاید تم کو خبر نہیں کہ میں نے ناسخ ہی کے متعلق یہ شعر کہا ہے۔ تعجب ہے کہ لوگ اس دور میں بھی ناسخ کو شاعر اور غزل گو تسلیم کرتے

---

[۱] جہاں تک "ناسخ" کے "امام فن" ہونے کا تعلق ہے وہ ایک ایسی مسلمہ حقیقت ہے جس سے آج تک کوئی بھی انکار نہیں کر سکا تعجب ہے کہ اکبر نے کس طرح یہ رائے قائم کر لی۔
خادم

کرتے ہیں۔ حالانکہ اپنا اب یہی خیال ہے کہ۔

عشق کے معنی کے عالم تھے مگر عاشق نہ تھے
صورت "عذرا" سے واقف تھے مگر "وامق" نہ تھے

(۱۳۲)

ہندوستان کے مشاعرے سخن فہمی اور سخن سنجی سے آگے بڑھ چکے تھے۔ سخن شناسی کی بجگہ "ترنم نوازی" نے لے لی تھی۔ ایسے ہی ایک "آل انڈیا" قسم کے مشاعرے میں مدعو کرنے کے لیے کچھ شعراء کرام تشریف لائے۔ اکبر نے بہت ٹالنے کی کوشش کی مگر یہ نہیں ٹلے کہنے لگے کہ آج تو وعدہ لے کر ہی جائیں گے۔

اکبر نے جب دیکھا کہ یہ ٹلنے ہی والے نہیں تو ہنس کر کہنے لگے بھائی ——

تم سے استادوں میں میری شاعری بیکار ہے
ساتھ سارنگی کا بلبل کے لیے دشوار ہے

(۱۳۳)

اکبر کی آغاز جوانی میں الہ آباد مشاعروں کا دلچسپ اکھاڑہ بنا ہوا تھا۔ ایک طرف ناسخ کے شاگرد۔ دوسری طرف تلق کے تلامذہ —— منشی میر درد کے عقیدت مند۔ ایک جانب وحید کے شاگرد دوسری طرف۔! ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے "اتحادیوں" کی فوجیں "جرمنی" کے خلاف محاذ جنگ قائم کیے ہوئے کھڑی ہیں یا جرمنی کے نازی اتحادیوں کے خلاف "مورچہ بند" ہیں۔

حکیم تفضل حسین فروغ (تلق کے بھانجے) کا الہ آباد میں ان دنوں اچھا دور دورہ تھا۔ شاگردوں کی پوری "بٹالین" لے کر مشاعروں میں جاتے تھے اور (داد و تحسین) کے رنگ میں "طنز و قدح" کے ترکش خالی کر کے مشاعرہ درہم و برہم کر دیتے تھے۔ ان مشاعروں میں اکبر بھی اپنے استاد "وحید" کے ساتھ شریک ہوتے اور وہ بھی اس آن بان سے کہ

سر پر سپاہیانہ صافہ بدن پر آب رواں کی گہرے رنگ کی قمیض ــــ اور ہلکے پھلکے کپڑے کی پرانی وضع کی چکین ــــ فروغ اکبر کو داد سخن کچھ اس انداز سے دیا کرتے تھے گویا جو کچھ وہ پڑھ رہے ہیں خود ان کا کہا ہوا نہیں ہے بلکہ استاد کا فیض کرم ہے ــــ فروغ کے اس رنگ کو دیکھ کر "نیّر" نے بھی یہی حرکتیں شروع کر دیں جو غالباً قوم کے "کنجڑے" تھے۔ بات بڑھی اور اس نوک جھونک میں ایک بار یہ طے پایا کہ "فی البدیہہ" مشاعرہ منعقد کر کے دیکھ لیا جائے کہ کون کتنے پانی میں ہے ــــ مشاعرہ منعقد ہوا۔ اسی وقت طرح دی گئی ــــ "کم نہیں ہوتا" "برہم" نہیں ہوتا۔ دو گھنٹے کا وقت مقرر کیا گیا ــــ اکبر نے وقت ختم ہونے سے بہت پہلے غزل مکمل کر لی۔ اور جب پڑھی تو مخالف صفوں پر سناٹا سا چھا گیا مطلع ہی میں اکبر نے "فروغ" اور "نیّر" دونوں پر چوٹ کی تھی۔

فروغ کم بضاعت رونق عالم نہیں ہوتا
مہ نو بدر ہو کر نیّر اعظم نہیں ہوتا

(۱۳۴)

جناب محمد اسمٰعیل رمزی ایڈوکیٹ (بھوپال) نے خود اکبر کی زبانی بیان فرمایا کہ اکبر ایک مرتبہ لکھنؤ میں قیام فرما تھے۔ ایک مشاعرے کا دعوت نامہ لے کر خود "میر مشاعرہ" بہ نفس نفیس تشریف لائے اور بڑے اصرار سے شرکت کا وعدہ لے گئے ــــ "میر مشاعرہ" تھے تو لکھنوی تہذیب و اخلاق کا نمونہ مگر صورت شکل کچھ ایسی "غیر شاعرانہ" پائی تھی کہ اکبر شش و پنج میں پڑ گئے ــــ وعدہ کر چکے تھے ــــ وقت مقررہ پر پہنچے اور مشاعرہ کی ہمہ ہمی میں "میر مشاعرہ" کے تصورات سے کچھ دیر کے لئے بے نیاز ہو گئے۔

مشاعرہ اتار پر تھا۔ شمع اکبر کے سامنے آئی ــــ غزل کے کئی شعر پڑھ گئے۔ داد ملی اور شایان شان ــــ یہاں تک کہ اکبر اس مصرعہ پر پہونچ گئے

قرآن میں آیا ہے خدا "حسن" سے خوش ہے؟

اچانک نظر اس "حسن مجسم" سے ٹکرائی جو "میر مجلس" کی حیثیت سے گاؤ تکیہ کا سہارا لئے ہوئے اپنی "بدصورتی" کے متعلق آخری فیصلہ کا منتظر تھا۔ اس مصرعہ کا مصرعہ ثانی کچھ ایسا ہی تھا کہ اگر اکبر پڑھ دیتے تو میر مجلس پر چھا جاتی۔ اکبر اس صورت حال کو سمجھ گئے اور فی البدیہہ دوسرا مصرعہ موزوں کر کے پڑھ دیا۔

کس حسن سے؟ یہ بھی تو سنو۔ "حسن عمل" سے

(۱۳۵)

"صہبا" ایک درویش صفت مگر باذاق شاعر تھے۔ اکبر کے پاس اکثر آیا کرتے تھے۔ ایک دن اکبر نے کہا۔ "بھائی صاحب" نماز عشاء محلہ کی مسجد میں پڑھ لیا کیجیے، میں بھی آجایا کروں گا۔ اس کے بعد دونوں اٹھ کر گھر چلے آئیں گے ذرا لطف صحبت رہے گا۔"؟

صہبا نے جواب دیا۔

جی ہاں۔ ضرور۔ ضرور۔

مگر عشا کا تو ذکر کیا۔ صہبا فجر تک نہ ہو سکے۔ کچھ دن چڑھے آئے تو شرمندہ سے! کہنے لگے۔۔

"بندہ نواز"۔۔ معاف فرمایئے گا میں شب کو نماز عشا میں شریک نہ ہو سکا مسجد میں پہنچا تو لق و دق عمارت بھائیں بھائیں کر رہی تھی۔۔ وہ دحشت۔۔ وہ ویرانی کہ الامان وحفیظ۔

اکبر اک ذرا خاموش ہوئے۔۔ مسکرائے اور اسی وقت یہ شعر کہہ دیا۔

شیخ جی رات کو مسجد میں نہیں جاتے ہیں
یعنی۔۔ ڈرتے ہیں کہ بیٹھا کہیں "اللہ" نہ ہو

(۱۳۶)

اکبر کے سالے "حافظ حسین" پرانے زمانے کے متمول گھرانے سے تعلق رکھتے تھے علوم مشرقی کی تعلیم تو ضرور پائی ہوگی مگر "نئی روشنی" کی تعلیمی ڈگریوں سے بے نیاز تھے ان

کی شادی کی بات چیت ایک ایسے خاندان میں شروع ہوئی جو تیزی کے ساتھ "ترقی" کی طرف دوڑ رہا تھا ـــــ اور سب باتیں تو خیر ٹھیک تھیں مگر گاڑی "تعلیم" کے سوال پر رک گئی ہاں کر ـــــ ! لڑکی والے چاہتے تھے کہ لڑکا کم از کم بی۔ اے پاس تو ہو اور حافظ جی بیچارے صرف ایک سیدھے سادھے حافظ۔

مطالبہ یہ کیا گیا کہ اگر یہ بی۔ اے پاس کرلیں تو شادی ہو سکتی ہے ورنہ......!

اکبر نے پہلے تو صرف ایک شعر میں۔

بے پاس کے تو ساس کی بھی اب نہیں ہے آس
موقوف شادیاں بھی ہیں اب امتحان پر

طنز کی ـــــ پھر وہ "لیلیٰ کی ماں" والا قطعہ لکھ مارا ـــــ جو "فرضی" نہیں ہے بلکہ سو فی صدی اصلی۔

خدا حافظ مسلمانوں کا اکبر　　مجھے تو ان کی خوشحالی سے ہے یاس
یہ عاشق شاہد معشوق کے ہیں　　نہ جائیںگے ولیکن سعی کے پاس
سناؤں اک تمہیں فرضی لطیفہ!　　کیا ہے میں نے جس کو زیب قرطاس
کہا مجنوں سے یہ لیلیٰ کی ماں نے　　کہ بیٹا تو اگر کرلے ایم اے پاس
تو فوراً بیاہ دوں لیلیٰ کو تجھ سے　　بلا دقت میں بن جاؤں تری ساس
کہا مجنوں نے یہ اچھی سنائی　　کجا عاشق۔ کجا کالج کی بکواس
بڑی بی آپ کو کیا ہو گیا ہے　　ہرن پر لادی جاتی ہے کہیں گھاس
یہ اچھی قدر دانی آپ نے کی　　مجھے سمجھا ہے کوئی ہرچرن داس
دل اپنا خون کرنے کو ہوں موجود　　نہیں منظور مغزِ سر کا آماس

یہی ٹھہری جو شرطِ وصلِ لیلیٰ
تو استعفیٰ مرا با حسرت و یاس

(۱۳۷)

محترمی پروفیسر آغا اشہر لکھنوی بیان فرماتے تھے کہ ۔۔۔ ایک مرتبہ اکبر مرحوم کے یہاں اکبر کے "فن و آرٹ" پر بحث ہو رہی تھی۔ ایک صاحب نے اکبر کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

افسوس زمانے نے آپ کی قدر نہیں کی؟ حالانکہ آپ نے زمانے۔ ماحول اور وقت کی جو نبض شناسی" کی ہے وہ کہیں دوسری جگہ نظر نہیں آتی۔

اکبر نے ایک "پرعزم" مسکراہٹ کے ساتھ جواب دے دیا۔ جی ہاں۔!

مری ناکامیابی کی کوئی حد ہو نہیں سکتی
تقیہ کر نہیں سکتا۔ خوشامد ہو نہیں سکتی

(۱۳۸)

ہندستان والے لیڈری اور "پیمبری" میں ہمیشہ فرق محسوس کرتے رہے چنانچہ کبھی ہندستانی لیڈر "خوردن برائے زیستن" کا قائل نہیں رہا۔ ایسے ہی ایک لیڈر کا سانحۂ وفات اس صدی کے آغاز میں موضوع بحث بنا ہوا تھا جنہیں ایک "قومی دعوت" سے واپسی پر "کالرا" ہوا اور بیچارے "انا للہ ... ہو گئے۔

اکبر بھی اس "قومی سانحے" سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے۔ فرماتے ہیں۔

اک ڈنر میں کھا گیا اتنا کہ نکلی تن سے جاں
خدمت قومی میں بارے جاں نثاری ہو گئی

(۱۳۹)

جس زمانے میں ایران پر روسیوں کی یلغار سے مسلمان میں خلفشار پیدا ہو گیا تھا ۔۔۔ اور ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اب اندر اب ایران میں روسی فوجیں داخل ہوئیں اکبر نے ہندستانی مسلمانوں کے "بے بس تاثرات" کی عکاسی فرماتے ہوئے کہا

"چناں بروند صبر از دل کے قصّے" یاد آتے ہیں
تڑپ جاتا ہوں یہ سُن کر کہ اب ایران جاتا ہے

(۱۴۰)

جناب سید محمد عسکری وکیل بھوپال نے بیان کیا۔
مجھے بچپن ہی سے حضرت اکبر اور ان کے کمال فن سے ایک قسم کا والہانہ عشق تھا جب تعلیم کے لئے الہ آباد پہونچا تو برابر حضرت اکبر کی خدمت میں حاضری کا شرف حاصل کرتا رہا۔ یہاں تک کہ بے تکلفی "گستاخیوں" کی حد تک پہونچ گئی وہ میری "آزاد خیالی" پر اکثر چوٹیں کیا کرتے تھے۔ چنانچہ سنہ ۱۹۵۱ء میں جب میری شادی کی تاریخ مقرر ہوئی تو شرکت شادی کا دعوت نامہ حضرت اکبر کی خدمت میں بھی بھیجا گیا۔ اکبر اپنی پیرانہ سالی اور (غالباً) خرابی صحت کی بنا پر شادی میں شریک نہ ہو سکے۔ معذرت نامہ بھیجا جس میں لکھا ہوا تھا۔

عقد سے کیا ہوں وہ خوش۔ کہتی ہیں بیوی ان کی
بے نمازی کو میں کب ہاتھ لگانے دوں گی
میں مسلمان کی لڑکی ہوں۔ مسلمان ہوں خود
سامنے بھی تو میں واللہ نہ آنے دوں گی
ساس کہتی ہیں میں پڑھواؤں گی سمجھا کے نماز
ایسے "مسٹر" کو میں کیا ہاتھ سے جانے دونگی؟

(۱۴۱)

جناب سید محمد عسکری وکیل بھوپال فرماتے تھے۔
جس زمانے میں میں سی۔ پی کے پولیس اسٹیشن "سیدھی" پر سب انسپکٹر پولیس تھا اکبر کا خط آیا کہ کہیں سے اچھا اور خالص گھی تلاش کر کے بھجواؤ۔ میں نے ایک

پیپا اصلی گھی فراہم کرکے روانہ کر دیا۔ شکریہ کی رسید آئی۔ یہ شعر لکھا ہوا تھا۔

برکت ہے یہ نام "عسکری" کی
سیدھی انگلی سے گھی تو نکلا!

(۱۴۴)

اکبر کے ایک بے تکلف دوست نے اپنی نئی ٹوپی دکھائی جس پر "قل ہو اللہ" کڑھا ہوا تھا۔

اس جدّت کو دیکھ کر بہت ہنسے۔ کہنے لگے۔ "چیز تو اچھی ہے۔ اگر کسی دعوت میں کھانا آنے میں دیر ہو جائے تو فوراً یہ ٹوپی پیٹ پر رکھ لینا۔ سب سمجھ جائیں گے کہ آپ کی انتڑیاں "قل ہو اللہ" پڑھ رہی ہیں۔

نسیم بکڈپو لکھنؤ کی شائع کردہ چند ادبی کتب

ہندوؤں میں اردو

جناب رفیق مارہروی نے اس کتاب میں اٹھارویں صدی عیسوی کے تمام ہندو شعراء کے حالات زندگی اور نمونہ کلام یکجا کر دیا ہے۔ قیمت 7/8

زبان داغ

رنگین بیان شاعر جناب داغ دہلوی کے ۲۵۰ خطوط کا مجموعہ جسے رفیق مارہروی نے ترتیب دیا ہے۔ 3/8

بزم داغ

جناب داغ دہلوی کا ایک رنگین روزنامچہ جسے رفیق مارہروی نے کتابی شکل دی۔

قیمت Rs 3/4

مشاعرہ عالم ارواح

سید مرتضیٰ حسین موسوی صاحب نے اردو کے تمام مرحوم شعراء کو جنت میں یکجا کر کے ایک بزم مشاعرہ ترتیب دی ہے جو اپنی نوعیت کے اعتبار سے ایک انوکھی چیز ہے۔ ہر صاحب ذوق اس کتاب کو پڑھ کر داد دیئے بغیر نہ رہے گا۔

قیمت مجلد چار روپیہ

699	5.8.62		
96			
22/6/73			